www.urducouncil.nic.in
राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद
National Council for Promotion of Urdu Language

نومبر 2019 ، قیمت :- ₹10

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly **BACHON KI DUNIYA**, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اُردو دُنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

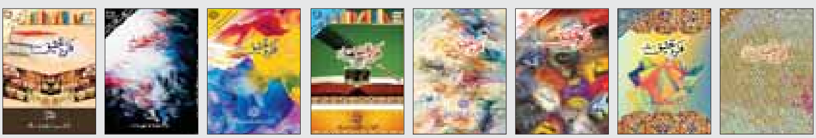

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد:7 شمارہ:11 نومبر 2019

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نائب مدیر :ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی -110025

فون:49539000

شعبہ ادارت:49539009-11

ای میل

bachonkiduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

قیمت : /10روپے، سالانہ/100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم

نئی دہلی -110066

فون:26109746

ای میل:sales@ncpul.in

ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز:22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد -500002

فون:040-24415194

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں		04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ		05
ماہ نومبر	26 نومبر یوم آئین بھارت	مرزا عبدالقیوم ندوی	06
	نومبر کے مہینے میں	نذیر احمد یوسفی	09
	یہ تھے اقبال	خان احتشام آصف	12
	احساس کی موت	یاور کفیل	16
نظمیں	اب میں بڑی ہوگئی	ضیاء الرحمن جعفری	19
	پانی بچایئے	مشتاق کریمی	19
	نوجوانوں کی دنیا	رضی عظیم آبادی	20
	نادان کوا	سراج احمد دلار	21
	بچوں کے لیے نظمیں	ساحر داؤدنگری	22
	چڑیا خانہ	سلیم سرفراز	23
مضامین	فرشتہ اور شیطان	سید نوشاد بیگم محمود	24
	چاول اور اس کی کھیتی	انصار احمد معروفی	26
	پانی کی کہانی، پانی کی زبانی	منظور پروانہ	29
	ہومر	سمیع الدین خاں شاداب	32
کہانیاں	بھونچال آنٹی	رام لعل	35
	جھوٹ سے توبہ	محمد قمر سلیم	37
	مدد ایک انمول جوہر	ملکہ تبسم	41
اردو کا جادو	اردو زبان کا جادو	ادارہ	44
باتصویر کہانی	انجن ناری کی کہانی اس کی زبانی	شمس الاسلام فاروقی	45
قسط وار ناول	بے زبان ساتھی	وکیل نجیب	49
کہکشاں	دانائی کی باتیں		55
	چمن چمن کے پھول		56
	آپ کی صحت	ضیا عالم کوسگوی	57
	بھارت ایک تعارف	سمیع الدین	57
ننھے فنکار	ہنسی کے غبارے		59
	چالاک گھوڑا	ابوبکر اپا صاحب عطار	60
	ماں	ادیبہ عفت	60
	بچوں کی پینٹنگ		61

آپس کی باتیں

''آپ نے ہمارا خواب اور ہمارا بچپن ہم سے چھین لیا ہے۔ ہم بچے آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔'' یہ الفاظ سویڈن کی ایک 16 سالہ طالبہ گریٹا تھنبرگ کے ہیں جس نے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ماحولیاتی بیداری کانفرنس میں عالمی رہنماؤں سے خطاب کرتے ہوئے کہے۔

پیارے بچو! گریٹا کی یہ تقریر اتنی متاثر کن تھی کہ سارے عالمی لیڈران نے اس کے درد کو محسوس کیا اور وہ ماحولیاتی تبدیلی کی ایک نمایاں آواز بن کر ابھری۔ اس بچی نے ماحولیاتی تبدیلی کے خطرناک اثرات کو محسوس کیا اور اپنے اسکول کے باہر 'ماحولیات بچاؤ' کی تختی لے کر بیٹھ گئی۔ دراصل یہ صرف گریٹا کا نہیں بلکہ پوری دنیا کے لوگوں اور خاص طور پر بچوں کا درد تھا اور ظاہر ہے کہ اِس درد کی وجہ یہ ہے کہ روز بہ روز ماحولیاتی تبدیلی کی وجہ سے انسانی زندگی مشکلات سے دوچار ہوگئی ہے۔

پیارے دوستو! ماحولیاتی تبدیلی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اگر جلد ہی اس پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی تو حالات بے حد خطرناک ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ ماحولیاتی تبدیلی کے بارے میں بیشتر ممالک بہت سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں اور پورے سال ملک کے کسی نہ کسی حصے میں اس اہم مسئلے پر بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ 23 ستمبر کو نیو یارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بھی ماحولیاتی تبدیلی پر خصوصی اجلاس منعقد کیا گیا جس میں ہمارے وزیر اعظم عالیجناب نریندر مودی نے بھی شرکت کی اور کہا کہ ''اب بات چیت کا وقت نہیں ہے بلکہ ہم سب کو کام کرنا ہوگا۔ انھوں نے مزید کہا کہ تعلیم، فلسفے اور اجتماعی وژن کے ساتھ اپنے برتاؤ میں تبدیلی لانے کی عالمی تحریک چھیڑنی ہوگی تبھی ماحولیاتی تبدیلی سے ہم نمٹ سکتے ہیں۔''

ماحولیاتی تبدیلی کی زندہ مثال آئس لینڈ کا اوکجوکل گلیشیئر ہے جس کی برف 900 برسوں کے بعد پگھل کر ختم ہوگئی اور اس کی موت کا باضابطہ اعلان کر دیا گیا۔ گلیشیئر کے خاتمے پر ایک تعزیتی تقریب بھی رکھی گئی۔ اس تقریب کے بعد گلیشیئر کی جگہ پر ایک یادگار نصب کی گئی جس میں مستقبل کے نام ایک خط میں یہ لکھا گیا ہے کہ ''یہ آئس لینڈ کا پہلا گلیشئر ہے جس نے گلیشیئر کی حیثیت کھو دی ہے۔ ڈر ہے کہ اگلے 200 برسوں میں ہمارے تمام گلیشئر کا یہ انجام ہو سکتا ہے۔'' اس گلیشیئر کا پگھلنا ایک بڑے خطرے کی علامت ہے کہ آنے والے دنوں میں اس زمین کو اور کتنی حرارت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اقوام متحدہ کے ایک جائزے کے مطابق 2015 سے 2019 کے درمیان زمین کے درجہ حرارت میں جتنا اضافہ ہوا ہے اتنا تاریخ کے 5 برسوں کے عرصے میں نہیں ہوا۔

دوستو! یہ سب باتیں بتانے کا مقصد بس اتنا ہے کہ آپ سب بھی ماحولیاتی تبدیلی کے اس اہم مسئلے کو سمجھیں اور اپنی اپنی سطح پر ماحولیات کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ زیادہ سے زیادہ پودے لگائیں، پانی اور بجلی برباد نہ کریں، درختوں کی کٹائی کو روکیں، کھانے کو ضائع نہ کریں، ضرورت مندوں کی مدد کریں اور ایک بہتر معاشرے کی تعمیر میں اپنا رول ادا کریں۔

آپ 'بچوں کی دنیا' پڑھیں اور اپنے خطوط ہمیں ضرور بھیجیں تا کہ آپ کی آرا سے رسالے کو مزید بہتر بنایا جا سکے۔

آپ کا

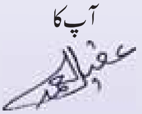

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاک خانہ

’بچوں کی دنیا‘ انگریزی ماحول میں اردو کی بقا اور اپنی مادری زبان کی حفاظت کے لیے ایک گلدستہ ہے۔ ’بچوں کی دنیا‘ میں آسان اردو، سلیس زبان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ بہت سی نظمیں، حقیقی کہانیاں چھپتی ہیں۔ تازہ شمارے میں ’جلیاں والا باغ‘ کے دردناک واقعے کو بہت ہی آسان زبان میں بیان کیا گیا ہے جس سے بچے اپنی تاریخ کو یاد رکھ سکیں گے۔ پچھلے 6 برسوں سے یہ رسالہ نمایاں خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہ رسالہ صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ دیگر ممالک میں بھی مقبول ہوتا جارہا ہے۔

حافظ عبدالستار راشدی، بائی پورہ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

’بچوں کی دنیا‘ جون 2019 کا شمارہ موصول ہوا۔ ہندوستان کی تاریخ سے متعلق، ریحان حسن کا مضمون ’جلیاں والا باغ، کی خونی داستان‘، سردار ریاض الحق کا مضمون ’جدوجہد آزادی کا شہید اودھم سنگھ‘، ’رام محمد سنگھ آزاد‘ لائق ستائش اور دل میں وطن کی محبت کی شمع مسلسل روشن رکھنے کے لائق ہیں۔ صفدر حسین نے بھی ’بھگت کبیر‘ لکھ کر موضوع کا حق ادا کیا ہے۔

ایم، اے شوکت کی نظم رمضان المبارک کامیاب اور اچھی نظم ہے۔ عاطف عدنان شیخ کا مضمون ’عید‘ بہتر مضمون ہے۔ ڈاکٹر محبوب راہی کی نظم ’بلند حوصلے بہت خوب!‘ تنویر اختر رومانی کی نظم ’سیکھو‘ اطمینان بخش ہے۔

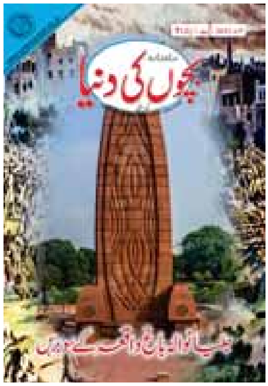

کہانیوں میں ذکیہ مشہدی، ایم رحمٰن، اکرم شبنم امروہوی کی کہانیاں بہترین اور کامیاب ترین ہیں۔ ڈرامہ انصاف کی قسط اول اور ناول شہر میں ایک جنگل کی قسط آخر بے حد لائق ستائش ہیں۔ بچوں کی کوششیں اور ہنسی کے غبارے سبھی خوش رنگ اور خوشبودار ہیں۔ ڈرائنگ کے نمونے خوشنما ہیں۔

محترم! یہ سچ ہے، 21 مارچ 1919 میں رولٹ ایکٹ نافذ کیا گیا، لیکن 1919 میں پہلی عالمی جنگ نہیں چھڑی۔ پہلی عالمی جنگ کا آغاز 1914 میں ہوا تھا اور اختتام 1918 میں۔

واقعی ایسی تاریخوں اور قربانیوں کو یاد دلانا محبانِ وطن کے لیے اہم ہے اور ضروری بھی۔ تاریخی واقعات بار بار کہنے اور سننے سے بھولے ہوئے سبق یاد ہوتے اور یاد رہتے ہیں۔ خصوصاً مضمون نگار: سردار ریاض الحق کے مضمون میں مجھے یہ جملہ بے حد مرغوب لگا۔ ’خونِ ناحق جب اپنی دھرتی پر گرتا ہے تو اسی دھرتی کے خمیر سے ہی کوئی نہ کوئی بدلہ لینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔‘

اشفاق کارنجوی، جی این آزاد اردو ہائی اسکول و جونیئر کالج، باڑے گاؤں، مہاراشٹر

مرزا عبدالقیوم ندوی

26 نومبر یوم آئین بھارت

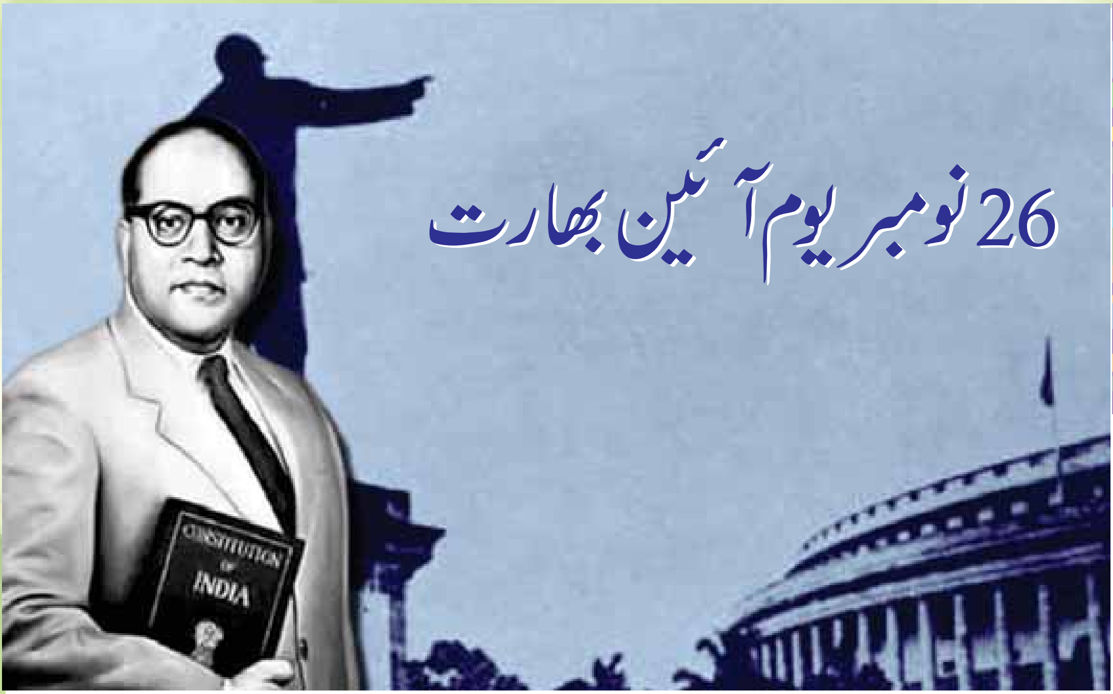

پیارے بچو! آپ جس اسکول میں پڑھتے ہیں، وہاں کے کچھ قوانین وضوابط ہوتے ہیں۔ جیسے آپ کے اسکول کا یونیفارم، اسکول کا وقت، اساتذہ کے گھنٹے، کلاس میں پابندی سے حاضری، اسکول کی فیس، سالانہ، ششماہی، سہ ماہی امتحانات وغیرہ۔ صدرمدرس، اسی طرح کلرک، ہرایک کا اپنا کام وذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ ظاہر سی بات ہے جب چھوٹے سے اسکول کے لیے اتنے سارے قوانین ہوتے ہیں تو ہمارے اتنے بڑے عظیم الشان ملک بھارت کے لیے جس کی آبادی ایک سو 35 کروڑ ہے، اس کے لیے قانون وضابطہ اور کسی دستور کا ہونا ضروری ہے۔

بھارت کے دستور کا نفاذ 26 جنوری 1950 کو عمل میں آیا تھا۔ اس کی ایک تاریخ ہے، جو مختصراً پیش کی جارہی ہے۔

دستور ساز کمیٹی کی تشکیل :

11/دسمبر 1946 کو دستور ساز کمیٹی کی میٹنگ میں ڈاکٹر راجندر پرساد کو صدر چنا گیا جو آخر تک اس عہدے پر فائز رہے۔ دستور ساز کمیٹی کے ممبران کا انتخاب ریاستی اسمبلیوں کے منتخبہ ممبران نے کیا تھا جس کے ممبران میں ڈاکٹر راجندر پرشاد کے علاوہ پنڈت جواہرلال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، سردار ولبھ بھائی پٹیل، ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر شامل تھے۔

اس 'دستور ساز کمیٹی' نے 2 سال 11 ماہ 18 دنوں میں جملہ 114 نشستیں منعقد کیں جن میں صحافیوں اور عوام کو شامل ہونے کی مکمل آزادی تھی۔ دستور کی تکمیل کے بعد اس پر سبھی 248 پارلیمانی ممبران نے دستخط کیے، جن میں 15 خواتین بھی شامل تھیں۔ بھارت کے دستور کو دنیا کا سب سے بہترین لکھا

ہوا دستور مانا جاتا ہے۔ دستور کی اصل کاپی کے تحفظ کے لیے خصوصی انتظام کے تحت اسے 'ہیلیم' کے اندر ڈال کر پارلیامنٹ کی لائبریری میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ دستور ہند کو چھاپا نہیں گیا بلکہ اس کی کتابت کی گئی اور ویسے ہی محفوظ رکھا گیا۔ دستور کو ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھا گیا تھا اور یہ دستور اپنی خوبیوں وطوالت کے سبب دنیا کے بہترین دستوروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ چونکہ انسانی حقوق کی آفاقی اہمیت ہے، اس لیے ہمارے آئین میں انسانی حقوق کے تحفظ کے سلسلہ میں بھرپور گنجائش رکھی گئی ہے۔

'تین شیر' جو ہمارا قومی نشان ہے، اسے سارناتھ میں اشوک اعظم نے بنوایا تھا، اس نشان کو 26/جنوری 1950 میں قومی نشان کے طور پر تسلیم کیا گیا۔

26 نومبر 2015 سے ہر سال 26/نومبر کو ہم 'یومِ آئین' کے طور پر مناتے ہیں۔ جس میں آئین سے متعلق عوام میں بیداری و آگاہی اور اس کے احترام وغیرہ سے متعلق مختلف نوعیت کے پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ بھارت کا آئین دنیا کا سب سے طویل آئین ہے۔ جس میں 395 دفعات (Articles)، 22 ابواب (Chapters)، 12 ضمیمے (Schedus)، اور 02 تتمے (Appndix) ہیں، اور 1,17369 الفاظ شامل ہیں۔ آئین اپنے 67 سالہ سفر میں 123 مرتبہ ترمیم (Constiutional amendments)

کے مرحلوں سے گزرا ہے۔جس میں آخری مرتبہ 11اگست 2018 میں قومی پسماندہ کمیشن کو آئینی درجہ دینے کے لیے ترمیم کی گئی۔

دستور کی تمہید میں کہا گیا ہے کہ''ہم بھارت کے عوام متانت وسنجیدگی سے عزم کرتے ہیں کہ بھارت کوایک مقتدر سماج وادی غیر مذہبی عوامی جمہوریہ بنائیں گے اوراس کوتمام شہریوں کے لیے حاصل کریں گے:

انصاف،سماجی،معاشی اورسیاسی،

آزادی خیال،اظہار،عقیدہ،دین اورعبادت،

مساوات بہ اعتبارحیثیت اورموقع،

اوران سب میں

اخوت کوترقی دیں،جس سے فرد کی عظمت اورقوم کے اتحاداورسلمیت کا تیقن ہو،

اپنی آئین ساز اسمبلی میں آج چھبیس نومبر، 1949 کو یہ آئین ذریعہ ہذا اختیار کرتے ہیں،وضع کرتے ہیں اوراپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں۔''

آسان لفظوں میں کہا جائے تو ہمارا آئین بھارت کو ایک مکمل، خود کفیل، سماج وادی،سیکولر،جمہوری ملک بنانا چاہتاہے اور دستور کے مطابق، یہاں تمام شہریوں کو سماجی، معاشی، سیاسی انصاف کے ساتھ نظریاتی وشخصی نیزعقیدہ ومذہب،عبادات کی آزادی حاصل ہے۔اس کے علاوہ دستور ترقی ودیگر معاملات میں سب کو یکساں مواقع، ہرفرد کو برابری اور بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دیتاہے۔ہمارا ملک کسی ایک مذہب وتہذیب کی نمائندگی نہیں کرتا اور نہ ہی یہاں کسی طرح کے تعصب کی اجازت دیتاہے۔

دستور کے مطابق شہریوں کو جو بنیادی اور اہم حقوق حاصل ہیں ان میں ووٹ دینے کا حق بھی شامل ہے۔اس کے علاوہ پسماندہ طبقات و جماعتوں کے لیے ملک کے دستورساز ایوانوں میں نمائندگی کے لیے نشستیں محفوظ رکھی گئی ہیں۔

ملک کے ہرشہری کواپنے مذہب،عقیدے اورزبان پر قائم رہنے،عمل کرنے اورتبلیغ واشاعت کی اجازت حاصل ہے۔ ملک کا کوئی بھی شہری کہیں بھی بود و باش اختیار کرسکتاہے۔ دستور نے یہ بھی حق دیا ہے کہ ہم آزادی کے ساتھ اپنی بات کو پیش کرسکتے ہیں۔بولنے،لکھنے کی آزادی ہمیں حاصل ہے۔مرد،عورت، بچے،بوڑھے سب کے حقوق دستورمیں قلم بند ہیں۔ انسانوں کے ساتھ جانوروں، پیڑ، پودوں، کھیت کھلیانوں، دریا،سمندر، ندیاں، تالاب کے بھی حقوق وقوانین ہیں۔جس طرح ملک کے بڑے شہروں میں رہنے والوں کوحقوق حاصل ہیں،اسی طرح دوردرازاورجنگلوں میں رہنے بسنے والے آدیواسیوں کوبھی اتنے ہی حقوق حاصل ہیں۔

پیارے بچو!جس طرح ہمارے دستور نےہمیں ہرطرح کے حقوق وآزادی دی ہے،اسی طرح ہمارے لیے بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے ملک کے دستوروقوانین کا احترام کریں اوراس کے تحفظ کا خیال رکھیں۔

■

Mirza Abdul Qayyum Nadwi
Mirza World Book House
Qaisar Colony
Aurangabad - 431001 (Maharashtra)

نذیر احمد یوسفی

نومبر کے مہینے میں

سال میں بارہ مہینے ہوتے ہیں۔ جنوری پہلا مہینہ اور دسمبر آخری مہینہ۔ نومبر کا مہینہ گیارہواں مہینہ کہلاتا ہے، آج ہم ہندوستان کے ان چند خاص لوگوں کے بارے میں آپ کو بتاتے ہیں جن کی پیدائش نومبر کے مہینے میں ہوئی ہے، ان خاص لوگوں میں سیاسی بھی ہیں، ادبی بھی اور علمی بھی اور ان کے نام اجنبی نہیں ہیں، کہیں نہ کہیں سنے ہوں گے اور پڑھے ہوں گے، تو آیئے شروع کرتے ہیں۔

یوسف ناظم (7 نومبر 1921): مہاراشٹر کے نمائندہ مزاح نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے، یوسف ناظم کی تحریروں میں طنز کی چاشنی کے ساتھ بلا کی شوخی اور طراری ملتی ہے۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اسے اتنا دلچسپ اور تر وتازہ کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو مضامین کی طوالت سے ڈر نہیں لگتا بلکہ اختتام پر افسوس ہوتا ہے، یوسف ناظم بڑے سیدھے سادے فطری فن کار تھے۔ ان کے فنی کمالات اور قلمی برق رفتاری نے انھیں طنز ومزاح کی دنیا میں کافی سے زیادہ مقبولیت بخشی، اہل اردو نے انھیں خوب سراہا اور پسند کیا، آدھے درجن کے قریب ان کی

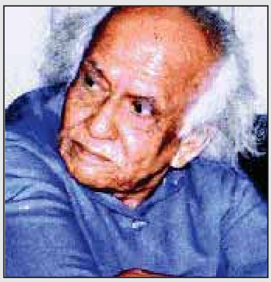

کتابیں ہیں جو انڈو پاک کے ادبی گاؤں وشہر کے مکینوں کو بے حساب خوشیاں بانٹ رہی ہیں۔

سر محمد اقبال (9 نومبر 1877): علامہ اقبال کی پیدائش کے دن یعنی 9 نومبر کو عالمی یوم اردو کے طور پر مناتے ہیں۔ اس خاص دن کو عوام کے لیے مقرر کیا گیا ہے، سر محمد اقبال سے محبت واحترام کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اس عالمی یوم اردو کے موقعے پر اقبال کا مکمل تعارف پیش کریں۔ اردو شاعری کی دنیا میں اقبال وہ واحد شاعر ہیں جن کی ہمہ گیر شاعری نے قوم مسلم کو ہی نہیں پوری دنیا کے راست پسندوں کو متوجہ کیا، ان کا کلام وطنیت اور قومیت کے جذبات کے ساتھ پورے عالم انسانیت کے لیے امن وسلامتی کا وسیلہ بنا۔ وہ احترامِ آدمیت کے علمبردار تھے کیونکہ اقبال کی فکر وفن کی بنیاد ہی ایمانی توانائی پر تھی۔

فتح علی ٹیپو سلطان (10 نومبر 1750): جب تک جسم میں جان رہی تھی انگریزی حکومت سے لوہا لینے والے دکن کے بہادر سپوت فتح علی ٹیپو سلطان نے ایسٹ انڈیا کمپنی

کے پاؤں جمنے نہیں دیے، لڑائی کا میدان سنبھالے رکھا، شجاعت، بہادری اور دانائی کا نام ہی ٹیپو تھا۔ ٹیپو کی قومی، ملکی اور ملی رواداری کے بہت سارے ثبوت ہیں جو دکن کی تاریخ میں دفن ہیں۔ چونکہ وہ اپنے زمانے میں انگریزی حکومت کے لیے بڑا حریف گنا جاتا تھا اس لیے اسے متعصب، سنکی اور ظالم حکمراں کے طور پر پیش کرکے اس کی نیک نامیوں کو بدنام کیا گیا، دلچسپ بات یہ ہے کہ لندن میوزیم میں ایک بڑی سی گھڑی ہے جس میں سے ہر گھنٹے پر ایک ٹیپو سلطان کے حلیہ والا آدمی نمودار ہوتا ہے جس کے پیچھے پیچھے ایک برطانوی حلیہ والا شیر آتا ہے اور اسے کھا جاتا ہے، جس پر وہاں موجود سیاح مزہ لیتے ہیں، دراصل یہ منظر، ٹیپو کے تئیں انگریزوں میں پایا جانے والا زہر کا عکس ہے، ٹیپو کا مقولہ ہے ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے'' بہت مشہور ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد (11 نومبر 1888): پورا نام، محی الدین احمد ابوالکلام آزاد ہے۔ مرکزی حکومت نے قومی یومِ تعلیم کو ان کے پیدائش کے دن سے منسوب کردیا ہے، اس کو یادگار بنانے کی غرض سے مختلف نوعیت کے دلچسپ پروگرام کیے جاتے ہیں۔

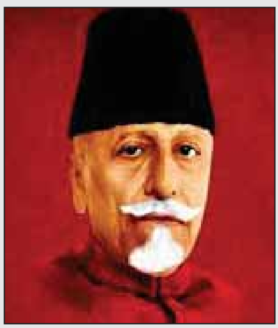

مولانا آزاد کی ابتدائی تعلیم، ان کے والدِ محترم شیخ خیرالدین کے زیرِ نگرانی گھر پر ہوئی، دینی و دنیاوی تعلیم میں وہ کسی انگریزی اسکول کے طالبِ علم سے بھی کہیں زیادہ قابل رہے۔ اردو، فارسی، انگریزی، فلسفہ، ریاضی اور منطق کی تعلیم میں وہ نمبروَن تھے۔ انھوں نے جدید مغربی تعلیم کے اصول کو بھی ضروری سمجھا اور اس زبان پر مکمل عبور حاصل کیا اور بعد میں انگریزی زبان میں انڈیا ونس فریڈم نام کی مشہور کتاب لکھی، ملک کی آزادی میں بھرپور حصہ لیا، کئی بار جیل گئے۔ آزاد ہند کے بعد پہلے وزیرِ تعلیم ہوئے، مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں جن میں غبارِ خاطر، تحریکِ آزادی اور مسلمان، ترجمان القرآن اور انسانیت موت کے دروازے پر مقبولِ عام ہوئیں۔

اسمٰعیل میرٹھی (12 نومبر 1844): بچوں کے ادب پر اس زمانے کے بڑے بڑے شعرا و ادبا نے خوبصورت اور دلچسپ نظمیں اور سبق آموز و نصیحت آمیز کہانیاں لکھیں لیکن بچوں کے ادیب و شاعر کی حیثیت سے مولانا اسمٰعیل میرٹھی کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی، نومبر کے دوسرے ہفتہ میں ان کی بھی پیدائش ہوئی۔

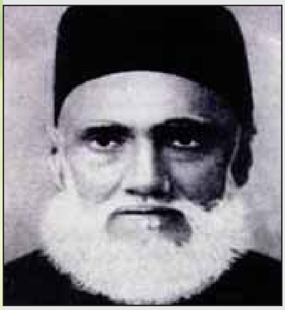

انھوں نے اپنی پوری زندگی بچوں کے ادب کی تخلیق میں گزاری۔ انھوں نے بچوں کی دلچسپی کے لیے بے حد معلوماتی اور صحت آموز کہانیاں اور نظمیں لکھیں جن کی مثال نہیں ملتی۔ درسی و نصابی کتابوں میں آج بھی ان کی نظمیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔

جواهر لال نهرو (14 نومبر 1889): جواہر لال نہرو کی پیدائش کے دن کو حکومتِ ہند نے ان کے مرنے کے بعد 'بچوں کا دن' یعنی (Childrence Day) قرار دیا ہے۔اس دن تمام تعلیمی درس گاہوں میں چھٹی رہتی ہے اور بچے چاچا نہرو کے اس دن کو نئے نئے پروگرام سے سجاتے سنوارتے ہیں۔

1947 میں انگریزی حکومت کے خاتمے کے بعد آزاد ہندوستان کے پہلے وزیراعظم جواہر لال نہرو ہوئے۔ان کی حکومت میں کانگریس پارٹی کے بڑے بڑے نیتا شامل ہوئے تھے، جن میں راجندر پرشاد، ولبھ بھائی پٹیل اور مولانا ابوالکلام آزاد کا نام سرِ فہرست ہے۔چاچا نہرو ایک اچھے سیات داں ہونے کے ساتھ ایک اچھے رائٹر بھی تھے، انھوں نے اپنے دورِ حکومت میں انڈیا کے قابلِ دید شہروں، گاؤں اور قلعوں کے بارے میں اپنی ایک کتاب میں بڑی دلچسپ معلومات دی ہیں۔'ڈسکوری آف انڈیا' اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوئی تھی۔

اکبر الہ آبادی (14 نومبر 1846): اکبر حسین اکبر الہ آبادی، طنز و مزاح کی شاعری کی وجہ سے بہت مقبول تھے، وہ انگریزی حکومت میں جج کے اعلیٰ عہدے پر تھے۔انھوں نے اپنی شاعری میں قوم، ملک، مذہب اور سماج پر گہری مگر دلچسپ نظمیں لکھی ہیں جو آج بھی پسند کی جاتی ہیں۔علی گڑھ کے بانی سر سید احمد خان کے اچھے دوستوں میں تھے اور مسلمانوں کے لیے انگریزی تعلیم کے حامی تھے، ان کی وفات کو زمانہ گزرا مگر ان کی طنزیہ اور مزاحیہ منظومات آج بھی مقبول ہیں۔لوگ اپنی تقاریر اور تحریروں میں انھیں استعمال کرتے ہیں اور اسی بہانے شاعر اکبر الہ آبادی کو یاد کرتے ہیں۔

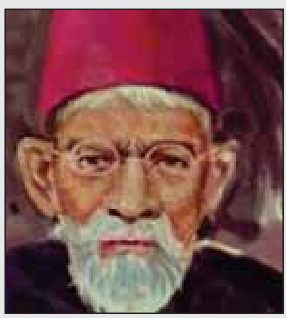

پریه درشنی اندرانهرو (17 نومبر 1917): اندرا گاندھی کی پیدائش الہ آباد میں ہوئی۔وہ چاچا نہرو، یعنی جواہر لال نہرو اور ماتا جی کملا کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ بچپن سے سیاسی ماحول ملا، اس لیے انھیں بھی سیاست سے دلچسپی رہی، بعد میں الیکشن کے ذریعے ملک کی پہلی وزیراعظم ہوئیں۔ملک میں ایک دور ایسا آیا کہ انھیں ایمرجنسی لاگو کرنی پڑی جس سے ہندوستانی سیاست میں ایک بڑا بھونچال آ گیا، ان کی موت انھیں کے سیکوریٹی گارڈ کی گولیوں سے ہوئی۔انتقال کا دن 31/اکتوبر 1984 ہے۔

■

Nazir Ahmad Yousufi
'Urdu Darbar"
Rahmania School Street
P.O: Asansol - 713302
Dist. Burdwan (West Bengal)

ماہ نومبر

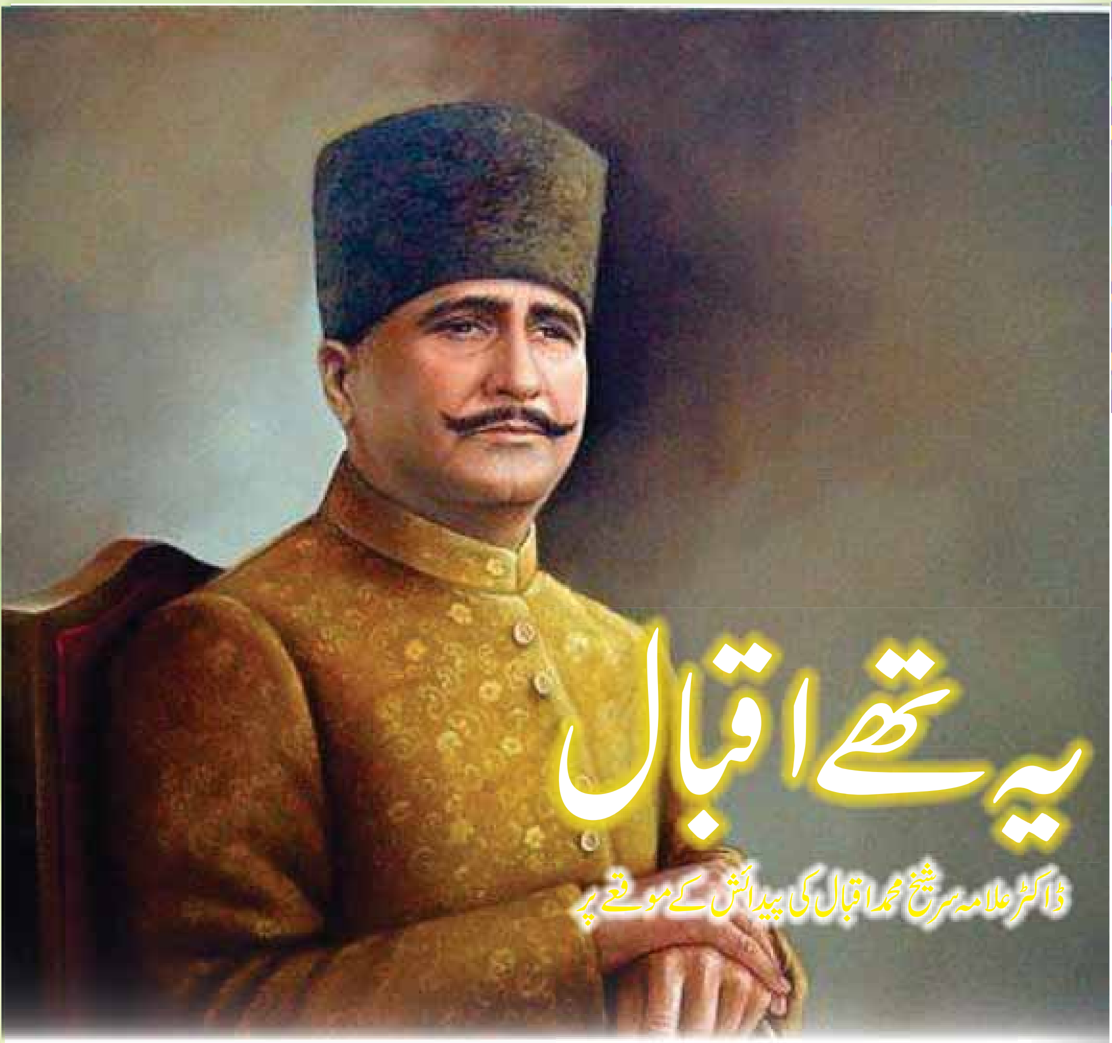

یہ تھے اقبال

ڈاکٹر علامہ سر شیخ محمد اقبال کی پیدائش کے موقعے پر

کسی خبر تھی کہ غالب، خسرو اور میر مرحومین کے بعد اس دارِفانی میں ایسا بھی کوئی شاعر آئے گا جو اردو ادب میں نئی روح پھونک دے گا۔ یہ تو اردو زبان کی خوش اقبالی ہے کہ اسے اقبال جیسا شاعر نصیب ہوا۔ اقبال اور غالب میں کافی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں یہ کہتا کہ غالب کا آفتاب جہاں آباد میں غروب ہو کر پنجاب سے نکلا اور اقبال نام پایا۔

ڈاکٹر علامہ سر شیخ محمد اقبال کی پیدائش 9/نومبر 1877 کو سیالکوٹ میں ہوئی۔ آپ کے والد شیخ نور محمد کے دو فرزند تھے۔ ایک عطا محمد اور ایک محمد اقبال۔ عطا محمد اقبال سے سترہ برس بڑے تھے۔ کچھ دنوں بعد عطا محمد انجینئر بن گئے اور اقبال نے سیالکوٹ کے مشن اسکول میں داخلہ لیا۔

شیخ نور محمد کے ایک قریبی دوست مولوی میر حسن، مشن اسکول میں عربی کے استاد تھے۔ اقبال نے عربی اور فارسی انھیں

سے سیکھی۔ علامہ کو مولوی صاحب نے فارسی کی بعض اونچی کتابیں انوارِ سہیلی، گلستاں، بوستاں وغیرہ پڑھائیں جن سے علامہ کے دل میں فارسی کی قدر و قیمت اور بڑھ گئی۔ جب سیالکوٹ میں کالج بن گیا تو اس میں داخلہ لیا۔ JC کے بعد BA کے لیے لاہور گئے اور وہاں کے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ اسی برس علامہ کو ایک عظیم شخصیت پروفیسر تھامس ڈاکٹر آرنلڈ کا شاگرد ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ پروفیسر آرنلڈ گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے استاد تھے۔

لاہور میں کئی چھوٹے بڑے مشاعرے ہوتے تھے جن میں شعرا اپنا کلام سناتے تھے۔ علامہ بھی ان مشاعروں میں شرکت فرماتے۔ دھیرے دھیرے سب کی نظریں ان پر پڑنے لگیں۔ ایک دفعہ کی بات ہے علامہ اپنا کلام سنا رہے تھے۔ اس مشاعرے میں مرزا ارشد گرڑگانی بھی تھے جو اس وقت بالمرتبہ شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ جب اقبال نے یہ شعر پڑھا

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

تو مرزا ارشد کہنے لگے ''میاں صاحب زادے! سبحان اللہ! اس عمر میں یہ شعر!

ان مشاعروں کے لیے علامہ نے غزلیں لکھنی شروع کیں۔ اس وقت کے نوعمر شعرا وقت کے ہمدوش ہمالہ شاعر فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی سے اپنے کلام کی اصلاح کرواتے تھے جو لوگ ان سے مل نہیں پاتے وہ بذریعہ ڈاک سے شاگردی حاصل کرتے۔ اب داغ دکن میں اور علامہ لاہور میں۔ اس میلوں کے فاصلہ کو ہندوستانی ڈاک نے ختم کردیا۔

علامہ نے بھی داغ کی شاگردی حاصل کرلی۔ پر علامہ کی غزلوں کو زیادہ اصلاح کی حاجت نہیں پڑی اور داغ نے خود خط میں لکھا کہ اب اقبال کی غزلوں کو اصلاح کی گنجائش نہیں اور اس استاد و شاگرد کے رشتہ کی یادیں دونوں طرف رہ گئیں۔

1899 میں علامہ نے انجمن حمایتِ اسلام کے ایک جلسہ میں اپنی نظم 'نالۂ یتیم' پڑھی جسے سننے والوں کی آنکھوں سے جا بجا آنسو نکل پڑے۔ دراصل علامہ کے چند دوست انھیں زبردست اس جلسے میں کھینچ کر لائے تھے۔ اسی جلسہ میں علامہ کی دوستی ایک عظیم شخصیت شیخ عبدالقادر سے ہوگئی۔ عبدالقادر نے آپ سے وعدہ لیا کہ جب عبدالقادر ترقی اردو کے لیے کوئی رسالہ جاری کریں گے تو اس کے ہر شمارے کے ایک نظم علامہ کو لکھنی ہوگی۔ علامہ نے وعدہ منظور کرلیا۔

جب 1901 میں عبدالقادر نے علامہ سے نظم مانگی تو علامہ نے کہا کہ معاف کریے گا ذہن میں نہ رہا، اس لیے نہیں لکھ پایا۔ انشاء اللہ اگلے شمارے سے لکھوں گا۔ عبدالقادر نے کہا ''وہ 'ہمالہ' والی دے دیجیے۔'' علامہ نے اسے دینے میں پس و پیش کی کہ انھیں لگ رہا تھا کہ اس میں کچھ خامیاں ہیں۔ پر عبدالقادر نے ان سے یہ نظم زبردستی لے لی اور ماہنامہ 'مخزن' کے پہلے شمارہ اپریل 1801 میں شائع کردی۔ یہیں سے علامہ کی شہرت کا آغاز ہوا۔ پھر علامہ اس کے ہر شمارے کے لیے ایک نظم لکھنے لگے۔

1905 میں علامہ یورپ گئے۔ وہ یورپ میں پروفیسر آرنلڈ کے ساتھ رہنے کے لیے گئے تھے ؏

توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

یورپ میں علامہ تین برس رہے۔ ان تین برسوں

میں ان کے اندر کافی کچھ تغیر ہوا۔

ایک دن انھوں نے اپنے دوست عبدالقادر سے کہا کہ اب ان کا ارادہ مصمم ہوگیا ہے کہ اب وہ شاعری ترک کردیں گے اور قسم کھالی کہ اب شاعری نہیں کریں گے۔ پر عبدالقادر نے ان سے کہا کہ اقبال کی شاعری ایسی شاعری نہیں ہے جسے ترک کردیا جائے۔ علامہ کچھ قائل ہوئے، کچھ نہیں۔ فیصلہ پروفیسر آرنلڈ کی رائے پر چھوڑ اگیا۔ اگر آرنلڈ عبدالقادر کی بات پر راضی ہیں، تو علامہ کو شاعری کا سلسلہ اسی طرح جاری رکھنا ہوگا اور اگر آرنلڈ اقبال کی بات پر راضی نہیں تو اقبال شاعری چھوڑ دیں گے۔ خوش قسمتی سے آرنلڈ نے عبدالقادر کا ساتھ دیا۔ اردو کو اس کی کھوئی ہوئی شان واپس مل گئی۔

1908 میں علامہ یورپ سے واپس آگئے۔ واپسی کے بعد علامہ نے بہت ساری نظمیں لکھیں جن میں شکوہ، جوابِ شکوہ اور قومی ترانہ نے کافی شہرت پائی۔ قومی ترانہ کا آخری شعر:

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

یہ شعر پہلے کچھ اس طرح تھا:

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا

یہ قومی ترانہ 'ترانۂ ہندی' کے نام سے ستمبر 1904 میں کانپور کے مشہور اردو رسالہ 'زمانہ' میں شائع ہوا جس کے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم تھے۔

علامہ جب بھی شعر گوئی کے موڈ میں رہتے، تو معمولی سی بات پر بھی نظم تحریر کردیتے۔ اسی بات کا ثبوت ہے نظم 'موٹر'۔ یہ نظم صرف اس بات پر لکھی گئی کہ ایک روز علامہ اقبال، سر جوگیندر سنگھ اور مرزا جلال الدین نواب سر ذوالفقار علی خاں کی موٹر میں سوار تھے۔ نواب صاحب نے یہ موٹر کار 1911 میں منگوائی جس کا نام کتابوں میں Talbot آتا ہے۔ اس زمانہ میں گاڑیاں چلتے ہوئے آواز کرتی تھیں مگر نواب صاحب کی گاڑی میں یہ نقص نہ تھا۔ تو سر جوگیندر سنگھ نے صرف اتنا کہا "نواب صاحب کی گاڑی کس قدر خاموش ہے۔" اگلے ہی روز علامہ نے نظم موٹر سپردِ قلم کردی۔ صرف اتنا ہی نہیں، علامہ نے اس نظم میں یہ بھی پیغام دیا کہ:

میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر
ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش

اس بات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ 1923 میں علامہ کو سر کا خطاب نواب صاحب ہی کی کاوشوں کے سبب ملا اور اقبال نے سر کا خطاب تبھی منظور کیا جب حکومت نے مولوی میر حسن کو شمس العلما کا خطاب دیا۔

آخری اوقات

علامہ کو کچھ عرصہ سے دردِ گردہ کا مرض تھا۔ ہر چوتھے پانچویں برس اس درد کے دورے پڑتے تھے۔ ایک مرتبہ 1924 عید کی نماز پڑھ کر آئے اور گرم دودھ ڈال کر سویاں کھالیں۔ سویاں کھاتے ہی آواز بیٹھ گئی۔ بہتر علاج کیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

1937 میں ان کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ بگڑتی حالت دیکھ کر بھائی عطا محمد نے چند کلمات تسلی کہے۔ پر اقبال نے کہا کہ "بھائی، میں ایک مسلمان ہوں۔ اور ایک مسلمان مرنے سے نہیں ڈرتا۔" اور یہ شعر پڑھا:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آمد تبسم بر لب اوست

وفات سے چند روز قبل بلغم میں خون آنے لگا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ شریانیں پھٹ گئی ہیں۔

آخرکار یہ شاعرِ مشرق 21/اپریل 1938 کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔

چل بسا اقبال، آہ! آئے گا کون اس کی طرح
اقبال تھا، اقبال ہی، اب نہ آئے گا وہ

اقبال کی موت کی خبر لاہور میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ بازار بند ہوگئے۔ سب لوگ 'جاوید منزل' کی طرف جانے لگے۔ شام کو اقبال کا جنازہ اٹھا۔ جنازے کے ساتھ کوئی پچاس ہزار افراد تھے۔ اقبال شاہی مسجد کے میناروں کے نیچے مدفون ہوئے۔

مانا اقبال ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی تصانیف بانگ درا، ضربِ کلیم، بالِ جبریل اور ارمغان حجاز (اردو) اور جاوید نامہ، اسرارِ خودی، رموزِ بیخودی اور پیامِ مشرق (فارسی) ہمیں آسانی سے مل سکتی ہیں۔ ہم اس سے استفادہ حاصل کریں۔ 'پیامِ مشرق' میں اقبال نے یورپ کے بلند پایہ شاعر گوئٹے کی 'سلامِ مغرب' کا جواب لکھا ہے۔

امید ہے آپ سب علامہ کی تصانیف سے استفادہ کریں گے۔

ضروری بات!

یہ سب جانتے ہیں کہ علامہ صرف فلسفیانہ انداز میں شعر گوئی کرتے تھے۔ پر ذیل کا واقعہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ علامہ ظریفانہ انداز میں بھی شعر کہتے تھے۔

مئی کا مہینہ تھا۔ آموں کی تجارت زور و شور پر تھی کہ علامہ کے گھر 'اکبر الہ آبادی' کے نام سے ایک پارسل آیا۔ پارسل میں عمدہ قسم کے لنگڑا آم تھے۔ آم دیکھتے ہی علامہ نے سوچا کہ اکبر کو اکبر ہی کے انداز میں جواب دیا جائے۔ اس پارسل کے بدلہ میں علامہ نے اکبر کو یہ شعر بھیجا۔

یہ سب اقبال، اکبر کی کرامت کا کرشمہ ہے
کہ الٰہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور آپہنچا

■

Khan Ahtesham Asif
266, Sangam Nagar
Wadala, Mumbai (MS)

جوابات

اردو زبان کا جادو

(5) پہچانو تو جانیں

آنسو		خال	
ہانڈی		طعنہ	
بن		اف	
دن		حسن	
صنم		رنگ	

یاور کفیل

احساس کی موت

"دھیمے سے شور کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی اور وہ ہولے ہولے قدموں سے اس شور کی طرف بڑھ رہا تھا— جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا، شور کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی— اچانک اس کے قدم ٹھہر گئے اب اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بے حد خوبصورت عمارت تھی جو نہ صرف بنی ہوئی خوبصورت تھی بلکہ آج مزید سجائی بھی گئی تھی جس کی وجہ سے اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے تھے۔

عمارت کے صدر دروازے سے اندر تلک ہلکے گلابی رنگ کے شامیانے سے پوری گیلری کو سجایا گیا تھا— مختلف قسم کے پھولوں سے سجا گیٹ لگا ہوا تھا جس کے کونوں پر رنگ برنگے غبّارے لگے ہوئے تھے—

بہت سی بڑی اور خوبصورت گاڑیاں دروازے کے آس پاس کھڑی نظر آ رہی تھیں— کچھ گاڑیوں سے لوگ اتر کر دروازہ سے اندر داخل ہو رہے تھے—

کچھ، خوبصورت نت نئے ڈیزائن کے قیمتی کپڑے پہنے ہوئے چھوٹے بچّے اپنے ہاتھوں میں تھال لیے ہوئے دروازے پر کھڑے تھے— تھال میں گلاب کے پھول بھرے ہوئے تھے، بچّے وہ پھول ہر اندر آنے والے مہمان کے ہاتھوں میں دے رہے تھے—

اب اس کے کانوں کو بے ہنگم شور جو دراصل گانوں اور

ملی جلی آوازوں کا تھا، صاف طور پر سنائی دے رہا تھا— اس کے قدم عمارت کے سامنے آ کر رک گئے— اس کی آنکھوں میں عجیب سا خالی پن تھا— وہ سونی سونی نگاہوں سے اس عمارت کی طرف دیکھ رہا تھا اور لگتا تھا جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہو—

اچانک وہ مڑا اور عمارت کے صدر دروازے کے برابر گلی سے اس کے پچھلے حصّہ کی طرف چل پڑا— شور بدستور جیسے اس کا تعاقب کر رہا تھا— لیکن عمارت کے پچھلے حصّہ میں خموشی تھی — یہاں نہ چہل پہل تھی نہ ہی لوگ آ جا رہے تھے— البتہ کچھ کتّے وہاں رکھے ہوئے کوڑے کے ایک ڈبّے کے آس پاس پڑے کچرے میں اپنا کھانا تلاش کر رہے تھے—

کتنے مہذب ہیں ہم لوگ جو کوڑا بھی ٹھیک طرح سے کوڑے دان میں نہیں ڈال سکتے بلکہ اسے کوڑے دان کے باہر ہی پھینک دیتے ہیں— اور صاف صفائی پر اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں گویا ہم سے زیادہ صفائی کا علم بردار کوئی اور ہے ہی نہیں—؟

کوڑے کا ڈبا اس عمارت کی دیوار کے قریب رکھا ہوا تھا اور اسے اپنے مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ معلوم ہو رہا تھا— وہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر اس عمارت میں ہو کیا رہا ہے—؟

اس نے تھوڑی سی کوشش کی اور پھر وہ کسی نہ کسی طرح اس کوڑے کے ڈبّے پر چڑھ گیا— اب وہ اتنا اونچا ہو گیا تھا کہ دیوار کے اس پار دیکھ سکتا تھا—

لیکن— کیا واقعی وہ اتنا اونچا ہو گیا تھا کہ دیواریں اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی تھیں—؟ نہیں— بلکہ شاید یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اس کی راہ میں اتنی دیواریں تھیں کہ انھیں توڑتے۔ توڑتے اس کی زندگی بھی پوری ہو جاتی اور دیواریں ختم نہ ہوتیں— تو کیا دیواروں کے ڈر سے چپ بیٹھ جانا چاہیے—؟ راہ میں رک جانا چاہیے—؟ ہمت ختم کر دینی چاہیے—؟

نہیں یہ مناسب نہیں کہ مشکلوں کے ڈر سے راستہ چلنا چھوڑ دیا جائے—؟ بلکہ ان مشکلوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے— بہت مثالیں موجود ہیں جہاں لوگوں نے اپنی ہمت، محنت، لگن اور کوشش سے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے جو بظاہر انسان کے لیے مشکل نظر آتے تھے— چاہے میدان کوئی بھی ہو — آگ سے لے کر کمپیوٹر تک کی ایجادات میں انسان نے ہزاروں مشکلات کا سامنا کیا لیکن نہ تو حوصلے کا دامن چھوڑا اور نہ ہمت ہاری — اس ہمت اور قربانی کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ہم ترقی کی نئی منزلیں طے کرتے جا رہے ہیں—

لیکن کیا واقعی—؟

اس نے دیکھا کہ اندر ایک خوب بڑا اور سجا ہوا میدان ہے جہاں خوب رونق اور چہل پہل نظر آ رہی تھی— بہت سے بچّے بنے ٹھنے اِدھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے— ایک جانب بہت ساری کرسیاں لگی ہوئی تھیں— کرسیوں پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے— سامنے اسٹیج بنایا گیا تھا جس کے پیچھے میوزک سسٹم لگا ہوا تھا اور بڑے بڑے اسپیکر نصب کئے گئے تھے جن سے نکلتی آوازیں اس کے قدموں کو یہاں تک کھینچ لائی تھیں—

خوشیوں کا ماحول تھا مانو کوئی میلہ لگا ہوا ہو— یہ منظر دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی—

تبھی اس نے دیکھا کہ کچھ چھوٹے بچّے اسٹیج پر آئے اور ایک قطار میں کھڑے ہوگئے— ان کے ہاتھوں میں ایک ڈبہ تھا اور سامنے تھوڑی دوری پر ایک اور بڑا سا ڈبّہ رکھا گیا تھا— ایک صاحب ہاتھ میں مائک لیے کچھ بول رہے تھے — اور پھر بچوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈبے میں ہاتھ ڈالا اور گیند نکال نکال کر سامنے پڑے ہوئے ڈبّے میں ڈالنے کی کوشش کرنے لگے —اچانک میوزک بند ہو گیا— بچے رک گئے—ایک شخص نے ان رکھے ہوئے ڈبوں میں سے گیندیں نکال کر ان کی گنتی کی پھر ایک بچّے کا ہاتھ اوپر اٹھایا شاید وہ بچّہ کھیل جیت گیا تھا— سب لوگوں نے تالیاں بجائیں—

پھر کچھ دیر بعد اسٹیج پر گول۔گول کرسیاں لگائی گئیں اور پھر سے میوزک بجنے لگا — بچّے اب ان کرسیوں کے چاروں طرف گول گول گھومتے ہوئے بھاگنے لگے—اچانک میوزک بند ہو گیا اور سبھی بچّے کرسیوں پر بیٹھنے لگے— جو بچہ کرسی پر نہیں بیٹھ پایا وہ کھیل سے باہر ہو گیا— یہ کھیل بھی کچھ دیر چلا—

اس کے ہونٹوں پر اب ہنسی تھی اور آنکھوں میں چمک—

پھر اس نے دیکھا کے اسٹیج پر دو ڈنڈے لگائے گئے اور ان کے بیچ ایک رسّی باندھی گئی— پھر اس رسّی میں کئی چھوٹی چھوٹی رسّیاں لٹکائی گئیں جن کے کناروں پر کچھ بندھا ہوا تھا— میوزک پھر بجنے لگا تھا اب کچھ بچّے جن کے ہاتھ پیچھے کی طرف تھے—اچھل اچھل کر اپنے منھ سے رسّی کے کنارے بندھی چیز کو کھانے کی کوشش کر رہے تھے— میوزک رک گیا اور کھیل مکمل ہوا—

اسی طرح لگاتار کھیل ہوتے رہے اور وہ دیکھتا رہا— لیکن اب اس کے ہونٹوں سے ہنسی غائب ہو چکی تھی اور آنکھوں میں چمک بھی نہ تھی بلکہ اب اس کے چہرے پر ویرانی اور مایوسی نظر آرہی تھی—

اب وہ نیچے اتر آیا اور جھکے ہوئے سر اور کندھوں سے واپس سڑک کی طرف کو چل دیا— تھکے تھکے قدموں سے وہ پھر سڑک پر عمارت کے صدر دروازہ کے سامنے آگیا— شور کی آواز اب بھی اس کے کانوں کو سنائی دے رہی تھی—

اس کی عمر تقریباً نو، دس سال تھی۔ وہ کوڑے کچرے سے اپنی ضرورت کا سامان بیننے کا کام کرتا تھا اور شہر کے گندے علاقے میں رہتا تھا—

اس نے نظر اٹھائی اور حسرت بھری نگاہوں سے عمارت کی طرف دیکھا جس کے سجے ہوئے دروازے کے اوپر ایک سجا ہوا بورڈ بھی نظر آرہا تھا جس پر لکھا تھا— ''سرسوتی انگلش میڈیم اسکول''

آج 14 نومبر بال دوس تھا— پنڈت جواہر لال نہرو جی کا یوم پیدائش—

وہ اب اسکول کے سامنے لوگوں کے پھینکے ہوئے کچرے کو اٹھا رہا تھا—

■

Yawar Kafeel
Moh.: Lal Masjid
Amroha - 244221
Distt: Amroha (UP)
Mob.: 9058677019

ضیاء الرحمن جعفری

اب میں بڑی ہوگئی

ممی اب میں بڑی ہوگئی
پاؤں پہ اپنے کھڑی ہوگئی

اپنا کام میں خود کر لوں گی
اب تم کو نہ تنگ کروں گی

نہیں پڑے گا تمھیں بتانا
ہے اسکول سویرے جانا

لنچ میں نخرے نہیں کروں گی
تم جو دو گی میں کھا لوں گی

پہلے کچھ جب کھو دیتی تھی
بات بات پہ رو دیتی تھی

نہیں کسی سے کچھ ڈرتی تھی
سب لینے کی ضد کرتی تھی

ہوگئی اب میں بہت سیانی
کرنی نہیں مجھے منمانی

■

Dr. Ziaurrahman Jafri
High School Maafi Nalanda
Via: Asthawan
Distt: Nalanda - 803107 (Bihar)

مشتاق کریمی

پانی بچایئے

ہر سمت ہاہاکار ہے، کچھ نہ سنایئے
باتیں بہت اب ہوچکیں، پانی بچایئے

چھوٹے میاں کو مہنگا موبائل تو دلایا
عریاں ہے نل ذرا اِسے، ٹونٹی لگایئے

ہر بوند بچانے کا بھی کرتے ہیں ارادہ
آنگن میں اپنے پھر کیوں پانی اڑایئے

تقریر بچت کے لیے کرتے ہیں خوب تر
تدبیر پر نہ اس طرح پانی بہایئے

جس کار نے بے کار بنا ڈالا آپ کو
اس کار پہ بس سوکھا ہی کپڑا گھمایئے

پانی کی تو کمی ہے بہت، پیارے نانا جان
ہفتے میں ایک بار تو مَل کر نہایئے

■

Mushtaque Karimi
342, Shahid A. Hamid Nagar
(Shani Peth)
Jalgaon - 425001(MS)

رضی عظیم آبادی

نوجوانوں کی دنیا

وہ دنیا جس کا ہر ذرّہ جنوں بردوش ہوتا ہے
وہ دنیا جس کے سینے میں بلا کا جوش ہوتا ہے
وہ دنیا جس میں حسن وعشق کی باتیں نہیں ہوتیں
وہ دنیا جس میں سونے کے لیے راتیں نہیں ہوتیں
جہاں تلوار کی جھنکار سے چشمے ابلتے ہیں
جہاں خود موت کی آغوش میں انسان پلتے ہیں
جہاں طوفاں میں قومیت وطن کی ناؤ کھیتی ہے
کمانوں کی کڑک میں حریت انگڑائی لیتی ہے
جہاں ہر دل میں آزادی کی ہوتی ہے لگن پیدا
جہاں ہوتا ہے شوقِ جاں نثاریِ وطن پیدا
جہاں آلام میں ہوتا ہے لوہے کا جگر پیدا
جہاں ہوتا ہے چھد کر ناوکوں سے بال و پر پیدا
جہاں جذباتِ خودداری دبانے سے ابھرتے ہیں
جہاں شیرانِ جنگ آور تھپکنے سے بپھرتے ہیں
جہاں خاشاک طوفانوں میں گھر کر مسکراتا ہے
جہاں خرمن شعاعِ برق سے آنکھیں لڑاتا ہے
جہاں کا چپہ چپہ، انقلاب آباد ہوتا ہے
دماغ و دل جہاں زنداں میں بھی آزاد ہوتا ہے
جہاں مجبور، جابر کی لحد تیار کرتا ہے
توانا کو جہاں بے دست و پا بیمار کرتا ہے
جہاں مظلومیت توہینِ استبداد کرتی ہے
جہاں شاہنشہی کو بندگی برباد کرتی ہے
جہاں ہمت جہاں تقدیر پر قانع نہیں ہوتی
کوئی مشکل جہاں تدبیر میں مانع نہیں ہوتی
تجھے اے نوجواں ایسا جہاں تیار کرنا ہے
اسی کوشش میں جینا ہے اسی کوشش میں مرنا ہے

بحوالہ: آزادی کی نظمیں، **مرتب:** سبطِ حسن، **سنہ اشاعت:** 2006،
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، بچوں کا ادبی ٹرسٹ

سراج احمد دلار

نادان کوّا

ایک کوّا پیاسا تھا
بستی بستی پھرتا تھا

بے چارے کا برا تھا حال
کیا چلتا وہ ہنس کی چال

اُڑتے اڑتے مٹکا دیکھا
جھٹ مٹکے پر کوّا لپکا

مٹکے میں جھٹ چونچ ڈبوئی
لیکن قسمت پھوٹ کے روئی

مٹکے میں تھا پانی تھوڑا
فوراً بیٹھا سر کو جوڑا

بات اچانک سمجھ میں آئی
دادا کی ترکیب لگائی

اس نے کنکر چن چن کر
مٹکے میں ڈالا گِن گِن کر

اک دو تین چار پانچ چھے
پانی اوپر آجا رے

ساتھ آٹھ نو آگے دس
اوپر والے پانی دے، بس

گنتی سو تک ہوگئی پوری
مٹکا بولا 'ساری، ساری'

پانی اوپر آئے کیسے؟
کوّا پیاس بجھائے کیسے؟

ڈالا چن چن اینٹ کے کنکر
کیسے آئے پانی اوپر؟

پی گئے کنکر پانی سارا
کوا پیاسا مرا بے چارہ

سوچ سمجھ کر کام کرو تم
روشن اپنا نام کرو تم

پڑھنا لکھنا عام کرو تم
عقل کو نہ بدنام کرو تم

سیانا بننا چھوڑو بھائی
بات ہماری سمجھ میں آئی

ہم نے سیکھا کوے نے
نادانی میں جان گنوائی

■

Ansari Siraj Ahmed Mohammad Mustafa
296, Chuna Bhatti
Malegaon (Nasik) - 423203 (Maharashtra)

ساحر داؤد نگری

بچوں کے لیے نظمیں

بطخ رانی

بطخ رانی
بڑی سیانی
ٹرٹر کھائے
دانا پانی
شان دکھائے
عجب کہانی
غول میں چل کر
ڈھونڈھے پانی
کہتی جائے
دنیا فانی

مٹھو کا اسکول

مٹھو بنا ہے فول
ڈال سے اڑ گئے سارے طوطے
مٹھو سے ہو گئے بھول
اب پنجرے میں جھول
پنجرے کے اندر کی دنیا
مٹھو کا اسکول
جو بھی باہر بولا جائے
مٹھو کرے قبول
اندر بیٹھ کے مٹھو بولے
روزی بھیج رسول

چندا ماما

چندا ماما، رات گئے تم کیوں آتے ہو؟
دن ہوتے ہی کھو جاتے ہو
یہ تو اچھی بات نہیں ہے
الفت کی سوغات نہیں ہے
دن کو بھی کچھ دیر تو ٹھہرو
اماں کے سنگ باتیں کر لو
پیار ہیں کرتے بچے سارے
تم ہو چندا ماما پیارے

■

Sahir Daud Nagri
275/6, Lalita Park
Laxmi Nagar
Delhi - 110092

سلیم سرفراز

چڑیا خانہ

پیارے بچو! ادھر تو آنا:　　تمھیں دکھائیں چڑیا خانہ

دیکھو بچو! یہ ہے بندر　　اچھل کود میں یہ ہے سکندر
ایک صفت ہے اور نرالی　　سب کی کرتا ہے نقالی
کوئی اس پر پتھر مارے　　یہ بھی الٹا پھینکے سارے
یاد ہے قصہ 'بندرنائی'　　نقل میں اپنی ناک گنوائی
کام کسی کی نقل میں کرنا　　صد فی صد نقصان ہے اپنا

دیکھو دو دو مور ادھر ہیں　　کتنے رنگیں بال و پر ہیں
جب یہ ناچیں پر پھیلائے　　قوس قزح بھی شرما جائے
رنگ روپ پر اتراتے ہیں　　پنچھی راجا کہلاتے ہیں
لیکن دیکھ کے پاؤں کو اپنے　　راجا جی کے ٹوٹیں سپنے
ناز کرے جو کون حسیں ہے　　یہاں مکمل کوئی نہیں ہے

دیکھو یہ ہیں بارہ سنگھے　　سینگ ہیں کتنے حسیں نوکیلے
کس خوبی سے سر پہ سجے ہیں　　جیسے دو دو پیڑ اُگے ہیں
خوب ہیں لیکن کام نہ آئیں　　خطرے میں یہ اور پھنسائیں
جن سینگوں پر یہ ہیں نازاں　　وہی اسیری کے ہیں ساماں
ہر تصویر کے پہلو دو ہیں　　یاد رکھیں دانشور جو ہیں

■

Saleem Sarfaraz (Md Salim)
JN. Pharmacy, KT Road
Asansol - 713302 (WB)

سید نوشاد بیگم محمود

فرشتہ اور شیطان

انسانی زندگی میں اچھا برا، نیک بد، فرشتہ شیطان ایسی کئی خوبیاں خامیاں ہوتی ہیں۔ ان سب کا سامنا ہر کسی کو کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن یہ تمام واقعات کس طرح تخلیق ہوتے ہیں۔ اسے تلاش کرتے وقت یہ بات ذہن میں ہونی چاہیے کہ یہ دونوں فطرتیں ایک دوسرے کے برعکس ہیں۔ یہ ہمارے اندر پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے کس فطرت کی جانب جھکنا ہے، کس فطرت کو پروان چڑھانا ہے اور کس فطرت کو ٹالنا ہے یہ آزادی تو ہر انسان کو حاصل ہے۔ والیا کولی کا بدل والمیکی رشی میں ہوا یہ تاریخ تو سب جانتے ہیں۔ عبدالقادر جیلانی جو کہ بچے تھے اور حصولِ علم کی خاطر دوسرے ملک جارہے تھے۔ ان کے حسن سلوک سے ڈاکو بھی نیک بن گئے اور ان کی شاگردی قبول کرلی۔ اسے کون فراموش کرسکتا ہے۔

بلندیاں اتر آتی ہیں اس کے آنگن میں
زمیں پہ رہتا ہے وہ شخص آسماں کی طرح

روی ایک نوجوان اور ابھرتا ہوا مصور تھا۔ ایک نامور مصور بننے کے لیے وہ سخت محنت کررہا تھا۔ ایک مرتبہ اخبار میں اشتہار شائع ہوا کہ کسی ادارے کو ایک خوبصورت شاہکار چہرے کی تصویر چاہیے۔ اس اشتہار کو روی نے پڑھا۔ اشتہار کی نوعیت یہ بتارہی تھی کہ کئی مصور فن کار اس میں حصہ لیں گے اور شاید یہاں سے فن کو ترقی ملے۔ یہ خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی اور اس نے ایک عمدہ تصویر اس نمائش میں بھیجنے کا ارادہ کرلیا۔ اس لیے اس نے فرشتہ صفت چہرے والے نسان کی تلاش شروع کردی۔ تلاش کرتے ہوئے وہ ایک اسکول میں پہنچا۔ وہاں ایک سات سال کا گول مٹول سا لڑکا نظر آگیا۔ اسی بچے کی تصویر بنا کر نمائش میں روانہ کرنے کی اس نے ٹھان لی۔ روی نے اپنے سامنے اس معصوم بچے کو بٹھا کر اپنی مہارت سے وہ تصویر بنائی۔ اپنی اس فنکاری پر وہ بے حد خوش لگ رہا تھا۔ اس نے تصویر کو آخری ٹچ دے کر مکمل کیا اور

ادارے کے حوالے کردیا۔ توقع کے مطابق روی کی یہ تصویر سب سے عمدہ تصویر کے روپ میں کامیاب ہوگئی اور روی کو اس تصویر کے سبب بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اسے بہت بڑا مصور سمجھا جانے لگا۔

تقریباً 15 برس بعد اسی طرح اخبار پڑھتے ہوئے ایک اشتہار اس کی نظر سے گزرا۔ اس اشتہار کے مطابق اسی ادارے کو ایک شیطان کا عمدہ عکس مصوری کے ذریعے چاہیے تھا۔ اشتہار پڑھ کر اسے اپنی پہلے پہل بنائی ہوئی معصوم صورت چہرے کی تصویر اور اس کی وجہ سے ملی ہوئی قدر و منزلت اور شہرت یاد آگئی۔ اب اس مقابلے میں بھی شرکت کرنے کا اس نے ارادہ کرلیا۔ روی کی پہلی عادت اب تک قائم تھی۔ سامنے جب تک اس انسان کی شبیہ نہیں آتی اسے مصوری کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ اس نے شیطانی تصویر کے لیے چہرہ تلاش کرنا شروع کیا۔ اسی تلاش میں وہ ایک جیل میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں کے ایک قیدی پر اس کی نظر ٹھہر جاتی ہے اور اس کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ شیطان کی تصویر کے لیے اس سے اچھا چہرہ ملنا ناممکن ہے۔ اسی قیدی کی تصویر بنائی جائے۔ قیدی کو سامنے بٹھا کر وہ تصویر بنانا شروع کرتا ہے۔ بہت ہی یکسوئی سے روی شیطان کی تصویر بناتا ہے۔ اپنی ہی مصوری اور فن کاری کو دیکھ کر وہ خوش ہوتا ہے۔ قیدی بوکھلا جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ روی سمجھ نہیں پارہا تھا کہ اس قیدی کو آخر کیا ہوگیا ہے؟ وہ قیدی سے رونے کی وجہ پوچھ بیٹھتا ہے۔ تب قیدی نے کہا۔ صاحب! جب میں سات سال کا تھا تب بھی آپ نے اسی طرح میری تصویر بنائی تھی اور آج بھی آپ نے میری ہی تصویر کیوں بنائی ہے مجھے معلوم نہیں۔ میں بری سنگت میں پھنس گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی چوریاں کرنے لگا اور پھر مجرموں کی ٹولی میں چلا گیا۔ ان کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن گیا اور ان سب کا انجام آج آپ کے سامنے ہے۔

■

Syed Naoshad Begum Mahmood
Shri Darshan Apartment, Bl 203
Mumbai, Puna Road, Shastri Nagar
Kalwa - 400605
Distt:Thane (Maharashtra)

انصار احمد معروفی

چاول اور اس کی کھیتی

روزانہ کے کھانوں میں کون سا ایسا کھانا ہوگا جس میں چاول نہ ہو، کون سی ایسی دعوت ہوگی جس میں چاول موجود نہ ہو، بلکہ کچھ دعوت تو صرف چاول کی ڈشوں سے مکمل ہوجاتی ہے، الغرض کوئی کھانا ہو اگر اس میں چاول نہیں تو وہ روکھا پھیکا مانا جائے گا، یہ چاول چاہے بریانی کی صورت میں ہو، یا پلاؤ کی شکل میں، زردہ کی صورت میں ہو یا بھات کی شکل میں ! کبھی اس کی فیرینی بنا کر مہمانوں کے سامنے فخر سے پیش کی جا رہی ہے، تو کبھی کھیر کی صورت میں بطور ہاضمہ رکھی جا رہی ہے، گھر پر کسی وجہ سے کچھ بھی پکانے کا موقعہ نہیں مل پایا تو کھچڑی ہی پکا کر پیٹ کی بھوک مٹالی۔

چاول ہمارے ملک کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے لوگوں کی غذائی ضرورت ہے، یہ دھان سے حاصل ہوتا ہے، دھان کا پودا تقریباً ایک میٹر لمبا گھاس جیسا ہوتا ہے، چاول دنیا کا خاص اناج ہے، جس کا دانہ دنیا کے آدھے حصے کی خوراک بنتا ہے، اس کا بیج ایک کھیت میں تیار ہوجانے کے بعد اسے اکھاڑ کر دوسرے کھیت میں بو دیا جاتا ہے، جسے ''روپائی'' کہتے ہیں، یہ خریف یعنی ''اساڑھ سے لے کر کاتک'' میں بویا جاتا ہے، جون میں بویا جانے والا یہ پودا ستمبر اور اکتوبر تک تیار ہوجاتا ہے۔

دھان مانسونی آب و ہوا میں پیدا ہوتا ہے، جون کے پہلے ہفتہ سے مانسونی ہوا چلنا شروع ہوجاتی ہے، کیونکہ اس مہینہ میں سمندری ہوا خشکی کی طرف چلتی ہے، جس میں نمی ہوتی ہے، اس کی وجہ سے جون سے ستمبر تک ملک کے زیادہ تر حصے میں بارش ہوتی ہے۔

دھان کی کھیتی کے لیے زیادہ پانی کی ضرورت ہوا کرتی ہے، اس کے لیے 20 سینٹی گریڈ کے اوسط درجۂ حرارت اور 100 سے لے کر 200 سینٹی میٹر کی ضرورت ہوتی ہے، مگر جہاں اتنی بارش نہیں ہوتی، وہاں بھی مختلف طرح سے پانی کا

انتظام کرکے اس کی کھیتی کی جاتی ہے، اس لیے چاول کے لیے ایسا کھیت چنا جاتا ہے؛ جس میں پانی رک سکے، اس کی رپائی اور نرائی کے لیے زیادہ مزدوروں کی ضرورت کے ساتھ پیداوار بڑھانے کے لیے ہری کھاد، گوبر کھاد اور کیمیاوی کھاد کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

اس کی رپائی، پانی بھرے کھیت میں جھک کر مشقت سے ہوتی ہے، اس کی بوائی میدانی علاقے کے علاوہ پہاڑوں پر سیڑھی نما کھیتوں میں پانی روک کر کرتے ہیں، کیونکہ چاول ہندوستان کے لوگوں کے لیے ہی نہیں ؛ بلکہ پوری دنیا کے لوگوں کی محبوب غذا ہے، ویسے تو اس کی پیداوار ہندوستان کے ان صوبوں بہار، بنگال، آسام، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، اڑیسہ، پنجاب اور ہماچل پردیش وغیرہ میں کثرت سے ہوتی ہے، مگر مغربی بنگال سب سے زیادہ چاول پیدا کرتا ہے، دوسرے نمبر پر اتر پردیش ہے۔

پوری دنیا میں چاول کی پیداوار میں بھارت دوسرے نمبر پر ہے، ہندوستان اور چین مل کر دنیا کے چاول کی پیداوار کا 50 فی صد حصہ تیار کرتے ہیں، لیکن سب سے پہلے جنوب مشرقی ایشیا میں یہ بویا گیا، بلکہ تھائی لینڈ میں کھدائی سے معلوم ہوا کہ وہاں پر آٹھ ہزار سال سے اس کی کاشت کاری ہوتی رہی ہے، ہمارے ملک کی آدھی آبادی چاول پر ہی گذارا کرتی ہے۔

اگرچہ شمالی ہندوستان میں اس کی بوائی سال میں ایک بار ہوتی ہے، مگر پوربی اور دکھنی ہندوستان میں ایک ہی سال میں اس کی دو یا تین فصلیں تیار ہوتی ہیں، دو فٹ اس لمبے پودے کے علاوہ اب سائنس دانوں نے ایک فٹ سے بھی کم کے پودے تیار کر لیے ہیں، تاکہ برسات میں بارش اور تیز ہوا کی وجہ سے اس کے پودے جھک کر زمین سے نہ لگ جائیں، جس سے فصل خراب ہو جاتی ہے۔

دھان کا پودا تقریباً چار پانچ مہینے میں تیار ہو جاتا ہے اور اس میں لمبی لمبی بال لگ جاتی ہے، اس کے دھان کی بھوسی اب مشینوں سے الگ کر لی جاتی ہے، چاولوں میں بے شمار قسمیں تیار کر لی گئی ہیں، موٹے چاول غریبوں کی بھوک مٹانے کے ساتھ، اس کے لمبے، خوشبود ار باریک چاول امیروں اور بڑے لوگوں کے دسترخوان کی زینت بنتے ہیں، جو لذت سے بھرپور ہونے کے ساتھ پروٹین، نشاستہ اور چربی جیسے صحت مند مادے سے لبریز ہوتے ہیں۔

اس کی کچھ قسمیں ؛ جیسے زیرہ بتی، باسمتی، امرتسری اور دھرا دون وغیرہ ایسے مقبول چاول ہیں جو شادی بیاہ اور دوسرے خاص موقع کے لیے بڑے اہم سمجھے جاتے ہیں، بہت سے خوشبو دار چاول اپنی عمدہ مہک کے ذریعے پہچان لیے جاتے ہیں، بلکہ اس کے کھیت بھی خوشبو دار ہوتے ہیں اور گزرنے والا وہاں ایک منٹ رک کر اس کی دلکش مہک محسوس کرتا ہے۔

دھان کی بھوسی جانوروں کے چارے کے طور پر کھلائی جاتی ہے، اس کا بھوسہ ہیٹ، چٹائیاں اور کاغذ بنانے میں استعمال ہوتا ہے، جاپانی لوگ اس سے ایک قسم کی شراب بھی تیار کرتے ہیں، جاپان میں سب سے زیادہ پسندیدہ چیز چاول ہے، لیکن چاول پیدا کرنے میں چین کا خاص مقام ہے، چین کے باشندے چاول کے کھیتوں میں مچھلی بھی پالتے ہیں، وہ پانی سے بھرے چاول کے کھیتوں میں مچھلی کے بچے چھوڑ دیتے ہیں۔ بنگلہ دیش، انڈونیشیا، جاوا، سماترا، فلپائن، سری لنکا، ملایا،

وغیرہ میں چاول کی بہترین کھیتی ہوتی ہے۔

ہر اچھی چیز کے دشمن ہوا کرتے ہیں، چاول کے بھی بہت سے دشمن ہیں، جو اس کے کھیت سے لے کر گودام تک اس کے درپے رہتے ہیں، ایک کیڑا؛ جسے ''کٹ ورم'' کہتے ہیں، رات کو دھان کے پودوں پر چڑھ کر اس کے ہرے حصے کو کھاتا رہتا ہے، کبھی تو نرم و نازک پودوں کو سرے سے کاٹ کر جدا کردیتا ہے، کچھ ٹڈے بھی فصلوں کو خراب کردیتے ہیں، ایک کیڑا دھان کے کومل پودوں کی مرکزی شاخوں میں گھس کر ان کو اس طرح کھاتا ہے جس سے شاخ سوکھ کر بے جان ہوجاتی ہے، اس کے علاوہ چاول کے گھن تو مشہور ہی ہیں، جو گوداموں اور چاول کے گوداموں میں رہ کر اندر سے اسے نقصان پہنچاتے رہتے ہیں، کبھی کبھی رکھے گئے چاولوں میں جالے پڑ جاتے ہیں، یہ کام چاول کے پتنگے کرتے ہیں، یہ کیڑے اپنے منھ کے لعاب سے چاول میں جالے بناتے ہیں، اور جالی کے اندر رہ کر اپنی غذا چاول سے حاصل کرکے چاول کو خراب کردیتے ہیں۔

ان کیڑوں کو مارنے کے لیے بہت سی دوائیں اور محلول بازار میں ملتے ہیں، جن سے وہ کیڑے مرجاتے ہیں، مگر پھر ان کی ایسی نسل تیار ہوجاتی ہے جو اس زہر کا دفاع کرلیتی ہے، اور ان میں قوت برداشت پیدا ہوجاتی ہے، اس لیے بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

■

Ansar Ahmad
Baluwa Kurthijafarpur- 275305
Mau, (UP)
Mob:8853214848

جوابات

1

منظور پروانہ

پانی کی کہانی، پانی کی زبانی

میں پانی ہوں۔ ہاں! پانی، وہ پانی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''پانی ہی زندگی ہے'' یہ بات اس لیے کہی جاتی ہے کہ اس زمین پر پائے جانے والے تمام جانداروں میں بنیادی طور پر میں موجود ہوں۔ اس زمین پر میری پیدائش کروڑوں برس قبل ہوئی تھی۔ میری پیدائش کے بعد ہی اس زمین پر زندگی کے آثار پیدا ہوئے تھے۔ یعنی میرے وجود سے ہی تمام جانداروں کا وجود ہے۔ میں زمین کے لگ بھگ تین چوتھائی حصہ پر پایا جاتا ہوں۔ میری مختلف شکلیں ہیں۔ کہیں برف کی شکل میں، کہیں بھاپ کی شکل میں۔ جب میں بھاپ کی شکل میں ہوا سے ملتا ہوں تو بادل کی شکل اختیار کر لیتا ہوں اور بادل سے بارش کے روپ میں برستا ہوں۔ میرا کچھ حصہ زمین کے اندر اپنی جگہ بنا لیتا ہے اور کچھ حصہ راستوں سے سمندر تک پہونچ جاتا ہے۔ اس طرح میری زندگی کا سرکل ہمیشہ تخلیق کے اصول کے مطابق چلتا رہتا ہے۔

یہاں آپ کے ذہن میں یہ سوال ضرور سر ابھار رہا ہوگا کہ کیا میں ہر شکل میں جانداروں کے استعمال کے لائق ہوں؟ اس کا جواب ہے ''نہیں'' حقیقت یہ ہے کہ جانداروں کے لیے میرا صاف اور اصل روپ ہی فائدہ مند اور لائق استعمال ہے۔ آپ کو یہ جان کر شاید حیرت ہو کہ میں اپنے اس روپ میں ایک فیصد سے کم تالابوں، نہروں، جھرنوں، ندیوں اور کنوؤں میں پایا جاتا ہوں۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ انسانوں نے میرے اس روپ کی اہمیت کو سمجھا ہی نہیں۔ دراصل مجھے اپنی کہانی سنانے کی ضرورت اس لیے پڑی تاکہ انسان میری اہمیت کو سمجھے اور میرے صاف اور اصل روپ کو قائم رکھتے ہوئے اسے آئندہ کے لیے بچائے۔

سال کے 365 دنوں میں انسان اپنی مختلف ضرورتوں کے لیے میرا استعمال کرتا ہے۔ مگر مجھے استعمال کرتے وقت شاید ہی اس کے ذہن میں یہ بات آتی ہو کہ میں کتنی قیمتی اور ضروری شے ہوں۔ قدرت کا انمول عطیہ ہوں۔ اس دنیا میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو میرا صحیح استعمال جانتے ہیں۔

میں آپ کو چند مثالیں دینا چاہتا ہوں جس سے آپ کو میری اہمیت اور قدرو قیمت کا اندازہ ہو جائے گا۔

تمام جانداروں کی زندگی کا انحصار مجھ پر ہے۔ زندگی کے تمام عمل اور ردِعمل میری بدولت ہی ممکن ہیں۔ زمینی نباتات میں 40 فیصد اور پانی میں پائے جانے والے پودوں میں 90 فیصد میری حصہ داری ہوتی ہے۔

زراعت، صنعت و حرفت، بجلی کی پیداوار اور نقل و حمل میں میرا کردار بہت اہم ہے۔ میری بدولت ہی انسان آج اتنی ترقی کر سکا ہے۔

میری پریشانی یہ ہے کہ بڑھتی آبادی کے ساتھ میری مانگ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ انسان کی بقا کے لیے اور تمام جانداروں کی زندگی کے لیے میرا آسانی سے فراہم ہونا ضروری ہے۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ میری صاف اور اصل نمک سے پاک، آلودگی سے پاک شکل میں موجودگی بھی بہت ضروری ہے۔ لیکن آج انسان کبھی لاعلمی میں تو کبھی جان بوجھ کر میرے ساتھ وہ سلوک کر رہا ہے کہ مجھے اپنی اصل حالت اور صاف شکل کو برقرار رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔

لوگ بغیر کچھ سوچے سمجھے مجھ میں خطرناک کیمیکل اور زہریلے مادے اور دوسری گندگی اس طرح ملا رہے ہیں کہ میری آلودگی اس خطرناک منزل پر پہنچ گئی ہے جہاں مجھے خود سانس لینا مشکل ہو رہا ہے یعنی مجھ میں آکسیجن کی کمی بڑھتی جا رہی ہے۔ بڑے بڑے کارخانے بھی ترقی کے نام پر چل رہی دوڑ میں میرے ساتھ وہ برتاؤ کرتے ہیں کہ بعض اوقات مجھے سوچنا پڑتا ہے کہ میری کوئی اصل، صاف شکل بھی ہے۔ ایسے خودغرض لوگوں نے میرا وہ حال کیا ہے کہ اب میں پینے کے لائق نہیں رہ گیا ہوں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زہریلے اور آلودہ پانی پینے کی وجہ سے لاکھوں مرد، عورتیں، بچے بیمار ہو کر موت کے منھ میں جا رہے ہیں۔ صرف انسان ہی نہیں جانور بھی آلودہ (گندہ) پانی کے استعمال کی وجہ سے موت کے منھ کا نوالہ بن رہے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے مگر میں کیا کروں۔ یہ سب تو انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ ہرے بھرے جنگلوں کو کاٹ کر ترقی کے نام پر کنکریٹ کے جنگل کھڑے کر دیے گئے ہیں۔ پہاڑوں کی ہریالی کو بھی ختم کر دیا گیا ہے۔ نتیجہ سامنے ہے۔ جن ہرے بھرے جنگلوں کو دیکھ کر بادل سے پانی برستا تھا اور علاقہ گلزار رہتا تھا وہاں اب ریگستان اگ آئے ہیں۔ یہی حال پہاڑوں کا بھی ہے۔ جب ننگے پہاڑوں پر میں برستا ہوں تو زمین پر کٹان ہوتا ہے۔ سیلاب آتا ہے زمین کو نقصان ہوتا ہے۔ جب یہ سب ہوتا ہے تو انسان اپنی غلطی ماننے کے بجائے مجھے اور قدرت کو اس کے لیے ذمہ دار گردانتا ہے۔ اگر انسان قدرت کے ساتھ دوستی رکھتا اور اس کے نظام کے خلاف اقدام نہ کرتا تو وہ نہ صرف محفوظ رہتا بلکہ قدرتی وسائل کے خزانوں سے مالا مال رہتا۔ مگر انسان اس طرف دھیان نہیں دیتا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو میری قیمت و اہمیت کا اندازہ ہے وہ ہمیشہ میرے حق میں انسانوں کو سمجھانے کا کام کرتے رہتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اپنی اس حالت زار کی طرف آپ کی توجہ دلاتے ہوئے مجھے آپ سے صرف اور صرف اتنی گذارش کرنی ہے کہ جو ہوا سو ہوا۔ آپ اب بھی بیدار ہو جائیں اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے مجھے محفوظ کرنے کے لئے باقاعدہ تحریک

چلائیں۔ یہ کام آپ کو اپنے گھر سے شروع کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے لوگوں کو میری اہمیت سے واقف کرائیں اور انہیں بتائیں کہ وہ کس طرح میری بربادی کو روک کر انسانیت کی فلاح کا نیک کام انجام دے سکتے ہیں۔ اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ عوام ہوں یا خواص، اسکول ہوں یا مدارس، گھر ہوں یا کارخانے، قدرتی وسائل سے متعلق سرکاری ادارے ہوں یا غیر سرکاری ادارے، سب کو یہ مورچہ سنبھالنا چاہیے۔ بچے، بڑے سبھی کو پانی بچانے کی مہم میں شریک ہونے کی ضرورت ہے۔

گھروں میں میرا استعمال کرتے وقت شاید آپ کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ آپ مجھے کس طرح برباد کر رہے ہیں۔ نہاتے وقت، کپڑے دھوتے وقت، دانتوں میں برش کرتے وقت، برتن صاف کرتے وقت تو آپ مجھے برباد کرتے ہی ہیں، کبھی کبھی اپنی کاہلی کے سبب نل کے خراب ہو جانے پر اسے وقت پر ٹھیک نہ کرا کر آپ مجھے برباد کرتے ہیں۔ اگر کوئی سمجھاتا ہے کہ یہ غلط ہے تو آپ جھنجھلا جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ پانی ہی تو بہہ رہا ہے تو کیا قیامت آ رہی ہے۔ آپ کو احساس نہیں ہوتا کہ جو پانی آپ برباد کر رہے ہیں وہ دوسرے کا حصہ ہے۔ اس لیے ضرورت ہے اس رویے کو بدلنے کی۔ اگر آپ یہ رویہ نہیں بدلیں گے تو آنے والے وقت میں جب آپ کو دقت کا سامنا ہوگا تب آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ مگر تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

مجھے برباد ہونے سے بچانے کی مہم کے ساتھ آپ کو ایک اور مہم بھی باقاعدگی سے چلانی ضروری ہے۔ اس دوسری مہم کا نام ہے صفائی۔ یعنی آپ کو پانی کی بربادی کو روکنے کے ساتھ اسے گندہ ہونے سے بچانے، زہریلے مادے سے بچانے وغیرہ کے لیے بھی مہم چلانی پڑے گی۔ اس سلسلے میں تالابوں، نہروں، ندیوں، کنوؤں کو ہر حال میں صاف رکھنے اور کسی قسم کے زہریلے مادے یا گندگی سے اسے بچانے کا کام کرنا ہوگا۔ تاکہ میں تمام انسانوں اور جانداروں کے لیے لائق استعمال بنا رہوں۔

■

Manzoor Parwana
Chikan Shop
Nazirabad, Lucknow-226018
Mob. 9452482159
Email : manzoorparwana7673@gmail.com

سمیع الدین خاں شاداب

ہومر

بچو! آپ اپنی درسی کتابوں میں بہت سی نظمیں، Poems اور کویتائیں تو پڑھتے ہی رہتے ہو۔ آپ کو ان نظموں کے اشعار کتنے اچھے اور سُریلے لگتے ہیں۔ کئی نظمیں یا ان کے اشعار تو ان کو دو چار بار پڑھنے سے ہی یاد ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر ان نظموں کو ایک خاص قاعدے اور خاص اصول پر بڑی محنت سے لکھتے ہیں۔

بچو! شاعری کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اپنے خیالات کو مناسب الفاظ کے سانچے میں بڑے سلیقے سے، بڑے قاعدے سے ڈھالنا پڑتا ہے۔ بار بار دیکھنا پڑتا ہے کہ ان اشعار کے ذریعے خیالات دوسروں تک آسانی اور روانی سے پہنچ سکتے ہیں کہ نہیں — جب شاعر اس کام میں پختہ ہو جاتے ہیں تو بڑی سے بڑی بات، بڑے سے بڑا واقعہ وہ شاعری کے ذریعے ادا کر دیتے ہیں۔

پرانے زمانے سے ہی دنیا کی ہر زبان میں شاعری ہوتی رہی ہے اور ہر زبان کے عظیم شاعر ہوئے ہیں۔ آج ہم آپ کو دنیا کے بڑے شاعروں میں سے ایک ہومر کے بارے میں بتائیں گے۔

ہومر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اب سے تقریباً تین ہزار سال سے پہلے یعنی حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے لگ بھگ 700 برس پہلے ہومر یونان میں رہتا تھا۔ اُس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اندھا تھا۔

ہومر کی زندگی کے حالات کے بارے میں حالانکہ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں لیکن اس کی دو نظموں 'ایلیڈ' اور 'اوڈیسی' کو پڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دنیا کے عظیم شاعروں میں سے ایک تھا اور یونان میں شاعری کا باقاعدہ دور ہومر سے ہی شروع ہوتا ہے۔ ہومر نے اپنی دونوں نظمیں آئیونک (Ionic) زبان میں کہی ہیں۔ بہت دنوں تک ان نظموں کو زبانی طور پر یاد کر کے ہی آگے بڑھایا گیا لیکن بعد میں ان کو لکھ لیا گیا۔

دراصل ہومر کا دورہ وہ دور تھا جب یونان میں پڑھنے لکھنے کا چلن شروع ہو رہا تھا اور جب یونانی لوگ شاعری کو زبانی یاد کر کے گانے بجانے کے علاوہ اس کو لکھ کر محفوظ بھی کرنے لگے تھے۔

یونان کی دیومالا میں جو قصے موجود تھے ہومر نے اپنی شاعری میں ان کا استعمال کیا ہے۔ کہیں کسی گم شدہ شخص کی تلاش ہے تو کہیں بچھڑے ہوئے لوگوں کا آپس میں ملنا ہے، کہیں سازشیں اور چالیں ہیں تو کہیں مکاری اور عیاری ہے اور کہیں عقل مندی، حوصلے اور بہادری سے سازشوں کو ناکام بھی کیا گیا ہے۔ کہیں سورماؤں کی جنگ ہے تو کہیں انسانوں اور دیوتاؤں کی دلکش محفلیں سجی ہوئی ہیں۔ ٹروزن کی جنگ، اوڈیسس کا سفر، ہیلن آف ٹرائے اور پینی لوپ کے قصے ہومر نے اپنی رزمیہ نظموں میں بیان کیے ہیں۔

بچو! رزمیہ نظمیں وہ ہوتی ہیں جن میں جنگوں کا ذکر ہو، بہادروں اور سورماؤں کے کارنامے ہوں۔

ہاں! تو ہومر نے دو بڑی رزمیہ نظمیں کہیں ہیں 'ایلیڈ' اور 'اوڈیسی'۔ 'ایلیڈ' دنیا کی سب سے مشہور نظموں میں سے ایک مانی جاتی ہے۔

'ایلیڈ' میں ٹرائے کی جنگ اور اس کے سورماؤں کی

بہادری کے قصے ہیں۔'ایلیڈ' میں یہ کہانی کہی گئی ہے کہ ٹرائے کے شہزادے پیرس (Paris) نے ایک بار اسپارٹا (یونان) کے بادشاہ مینڈس (Mendaus) کی حسین ملکہ ہیلن (Halen) کو چرا لیا۔

ہیلن یونانی دیومالا کی سب سے زیادہ حسین عورت تھی۔ یونان کے تمام بڑے سردار اور جانباز سپاہی اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ ہیلن کے سوتیلے باپ ٹائن ڈیرئس (Tyndereus) کو یہ ڈر لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہیلن کی وجہ سے یہ یونانی سردار آپس میں ہی لڑ جائیں۔ اس لیے اس نے ہیلن کو ہی اپنا شوہر چن لینے کا اختیار دے دیا۔ ہیلن نے مینڈس سے شادی کرلی لیکن تب ہی ٹرائے کا ایک خوبصورت شہزادہ ہیلن کو اٹھا کر لے گیا۔ مینڈس کے بھائی ایگے مینن (Agemennon) نے یونانی سورماؤں کی ایک بڑی فوج اکٹھا کی اور ٹرائے پر حملہ کردیا اور اس طرح یونان کے اسپارٹا اور ترکی کے ٹرائے میں ایک لمبی جنگ چھڑ گئی۔

یہ جنگ دس سال تک چلی۔ دونوں طرف کے بہادر سورما بڑی تعداد میں مارے جانے لگے۔ اتنی خوفناک جنگ کے باوجود اسپارٹا اور ٹرائے میں سے کوئی بھی یہ جنگ نہ جیت سکا۔

آخرکار یونانیوں نے ایک چال چلی۔ انھوں نے بہت بڑا لکڑی کا ایک کھوکھلا گھوڑا بنایا جو پہیوں پر کھینچا جاسکتا تھا۔ اس گھوڑے میں بہت سے یونانی سپاہی گھس کر بیٹھ گئے۔ باقی فوجیوں نے اپنا سامان باندھا اور واپس جانے کے لیے روانہ ہوگئے۔ ٹرائے والوں نے جب یہ دیکھا کہ یونانیوں کی فوج واپس چلی گئی تو وہ سمجھے کہ شاید یونانی اس لمبی جنگ سے تنگ آکر بھاگ گئے۔ اب ٹرائے کے فوجی شہر کا پھاٹک کھول کر باہر آئے انھوں نے دیکھا کہ میدان میں ایک بڑا لکڑی کا گھوڑا کھڑا ہے۔ وہ سمجھے کہ یہ شاید یونانیوں کے کسی دیوتا کا مجسمہ ہے۔ اپنے شہر کے دوسرے لوگوں کو دکھانے کے لیے وہ اس گھوڑے کو کھینچ کر ٹرائے میں لے گئے اور جیت کا جشن منانے میں مشغول ہوگئے۔ رات کو موقع پا کر یونانی گھوڑے کے پیٹ سے باہر نکل آئے اور انھوں نے شہر کے پھاٹک کھول دیے۔ باقی یونانی سپاہی جو دراصل واپس گئے ہی نہیں تھے تب تک وہاں آگئے اور ٹرائے میں داخل ہوگئے۔ انھوں نے ٹرائے پر قبضہ کرلیا اور پورے شہر میں آگ لگا دی۔ اس طرح اسپارٹا والوں کی جیت ہوئی۔ ہیلن دوبارہ یونانیوں کو مل گئی اور وہ اسپارٹا کے بادشاہ مینڈس کی ملکہ بن گئی۔

بہت دنوں تک لوگ اس کو ایک فرضی قصہ سمجھتے۔ لیکن 19 ویں صدی میں جرمنی کے ایک محقق (کھوج کرنے والے) نے ترکی میں ٹرائے کے کھنڈروں کو تلاش کرلیا۔ اس شہر کے کھنڈروں سے یہ بھی پتہ چلا کہ ٹرائے کو ایک بھاری تباہی کا سامنا کرنا پڑا تھا اور پھر اس کو دوبارہ بسایا گیا تھا۔

'ایلیڈ' میں اسی رزمیہ قصے کو پیش کیا گیا ہے۔

ہومر کی دوسری نظم 'اوڈیسی' ہے۔ 'اوڈیسی' دراصل اوڈیس (Odysseus) کا سفرنامہ ہے۔ اوڈیس ٹرائے کی جنگ کا ہی ایک جانباز سپاہی ہے اور اتھاکا کا رہنے والا ہے۔ وہ ایک لمبے سمندری سفر پر جاتا ہے۔ اس سفر میں وہ طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرتا ہے۔

جس وقت اوڈیس خطروں کا سامنا کرتا ہوا سمندر کا سینہ چیرتا ہوا لگاتار جدوجہد کے ساتھ آگے بڑھتا جا رہا تھا— ٹھیک اسی وقت کچھ لالچی اور غدار لوگ اس کے گھر پر اس کی

دولت اڑا رہے تھے اور اس کی بیوی پینی لوپی (Pene Lope) سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ سفر سے واپس آنے کے بعد اوڈیسس نہایت عقلمندی، جرأت، حوصلے اور بہادری سے ان خراب حالات کا سامنا کرتا ہے اور تمام غداروں کو سزا دے کر اپنے والد لائرٹیز، اپنے بیٹے ٹیلی ماکوزا اور اپنی بیوی پینی لوپی سے مل جاتا ہے۔ یونانی دیوتا ذییس کی بیٹی اتھینی اس کی بھرپور مدد کرتی ہے۔

ہومر کی ان دونوں نظموں نے یونانی تعلیم، وہاں کی زبان اور ادب کو بہت متاثر کیا اور ان ہی نظموں پر یونانیوں نے اپنی تہذیب کی بنیادیں قائم کیں۔ ان نظموں نے بعد کے شاعروں کو بھی بہت زیادہ متاثر کیا۔ مشہور شاعر ورجل (Virgil) نے ہومر کی 'الیڈ' اور 'اوڈیسی' میں بیان قصوں کو ملا کر اپنی مشہور رزمیہ نظم 'اینی اِیڈ' (Aeneid) لکھی ہے۔

ہومر کی ان دونوں نظموں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یونانیوں کے زندگی گزارنے کے کیا طور طریقے تھے، ان کے رسم و رواج کیا تھے، ان کا عقیدہ کن دیوی دیوتاؤں پر تھا اور وہ دیوی دیوتا انسانوں کی مدد کس طرح کرتے تھے اور کس طرح غضب ناک بھی ہو جاتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ یونانیوں نے اپنی حکومت کی طاقت کس طرح بڑھائی۔

ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی وہ عظیم الشان رزمیہ نظمیں ہیں جنھوں نے پوری دنیا کے ادب کو متاثر کیا۔

■

Dr. Samiuddin Khan 'Shadab'
Masjid Zahuruddin, Gujar Tola
Rampur - 244901 (UP)

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'بچوں کی دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.. بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009

میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

رام لعل

بھونچال آنٹی

ٹنّو اپنی آنٹی کے ہاتھوں بہت پریشان تھا۔ اس کی پہلی پریشانی تو یہ تھی کہ آنٹی اُسے اصلی نام کی بجائے ابھی تک بچپن کے نام سے ہی پکارتی تھی، جب کہ وہ اب بچہ نہیں رہا تھا، آٹھویں درجے میں پڑھتا تھا۔ اسکول میں اُسے برج ٹنڈن ساہنی کہا جاتا تھا، لیکن گھر پہنچتے ہی آنٹی کے لیے وہ بس ٹنّو ہو کر رہ جاتا تھا۔ جب دیکھو ٹنّو! جہاں دیکھو ٹنّو! ہر وقت ٹنّو، ٹنّو، ٹنّو، ٹنّو کی پکار لگتی رہتی تھی۔

اُس نے آنٹی سے بیسیوں بار کہا تھا، ''آنٹی مجھے اب ٹنّو نہ کہا کرو۔'' لیکن آنٹی نے اسے ہر بار ایک ہی جواب دیا تھا، ''میں تو تمھیں اسی نام سے پکاروں گی، چاہے جتنے بھی بڑے ہو جاؤ۔ میں نے ہی تمھارا یہ نام رکھا تھا، جب تم ایک ہاتھ جتنے تھے۔ سمجھے! ٹنّو نام مجھے بہت پیارا لگتا ہے— جتنے پیارے تم لگتے ہو۔''

یہ کہہ کر آنٹی ہمیشہ پیار سے دونوں ہاتھوں میں اس کا سر پکڑ لیتی۔ چاہتی کہ اس کے سر کو چوم لے لیکن ایسا کرنے میں وہ اس کے بڑی محنت سے سنوارے ہوئے بال بگاڑ دیتی اور ٹنّو جھنجھلا کر اس کے ہاتھوں کی پکڑ سے دور بھاگ جاتا۔ جیب سے چھوٹی سی کنگھی نکال کر بالوں کو پھر سے سنوارے ہوئے کہتا، ''آنٹی مجھے جس نام سے چاہو پکار لو، لیکن میرے بالوں کو نہ چھوا کرو۔''

یہ سن کر آنٹی اسے پکڑنے کے لیے اس کی طرف پھر لپکتی، تا کہ اس کے سر پر ہاتھ رگڑ کر بال بالکل ہی خراب کر دے، لیکن ٹنو جلدی سے گھر سے ہی بھاگ نکلتا تھا۔

ٹنو کی دوسری پریشانی یہ تھی کہ اس پر نظر پڑتے ہی آنٹی کو بہت سے کام یاد آ جاتے تھے۔ وہ اسے نہ کبھی آرام سے بیٹھنے دیتی نہ چین سے کھیلنے کی مہلت بخشتی۔ کسی نہ کسی کام کے لیے یہاں وہاں دوڑاتی ہی رہتی تھی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ آنٹی کے بہت سے کام تو انکل بھی کر سکتے تھے، اور وہ انھیں کرنے کے لیے آمادہ بھی رہتے تھے لیکن آنٹی تو ان لوگوں میں سے تھی جو اپنے شوہر کو بے حد بے وقوف سمجھتی ہیں، اور بچوں کو بے حد ذہین۔ ایک بات اور بھی تھی۔ آنٹی کے اپنے دو بچے یوگی اور کِٹی بھی تھے، جو کام سے کبھی جی نہیں چراتے تھے لیکن آنٹی کو صرف ٹنو سے کام لینا اچھا لگتا تھا۔

کبھی کبھی تو ٹنو شکایت بھی کر بیٹھتا، ''آنٹی، تمھارے کاموں سے تنگ آ کر میں اپنے ڈیڈی کے پاس لوٹ جاؤں گا۔'' لیکن آنٹی چمک کر جواب دیتی، ''تم سمجھتے ہو کہ میں وہاں نہیں پہنچ سکوں گی! تم سے کام لینے کے لیے میں ہر جگہ جا سکتی ہوں، کیونکہ ایک تم ہی اتنے اچھے بچے ہو کہ میرا ہر کام اچھی طرح کر دیتے ہو۔''

ٹنّو جانتا تھا کہ آنٹی یہ بات خوشامد کے طور پر کہا کرتی ہے لیکن وہ آخر ہار مان لیتا۔ اِس طرح کی خوشامد کبھی کبھی اسے اچھی بھی لگتی۔ پھر آنٹی کام کے بدلے میں ٹافیاں بھی تو دیا

کرتی تھی۔ ٹافیاں پا کر ٹنّو ساری شکایتیں بھول جاتا تھا۔

آنٹی کی وجہ سے پورا گھر شور سے گونجتا تھا۔ اسی کی وجہ سے ٹنو کو گھر کی ہر چیز حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اسی لیے ایک روز ٹنو کے دل میں اچانک یہ خیال پیدا ہوا کہ آنٹی کا نام کیوں نہ بھونچال آنٹی رکھ دیا جائے! وہ ہر معاملے میں ایک بھونچال ہی تو ہے۔ صرف باتوں اور عادتوں کی وجہ سے ہی نہیں، جسم کے رقبے کے لحاظ سے بھی وہ ویسی ہی ہے۔ اس کے قدم، اٹھاتے ہی زمین کانپتی ہوئی سی لگتی ہے۔

ٹنّو نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ کسی مناسب موقعے پر وہ آنٹی کے نئے نام کا اعلان کردے گا۔ یہ نام یقیناً سب کو پسند آئے گا۔ بس اسے بھونچال آنٹی کہنے لگیں گے۔ اس طرح وہ آنٹی سے ٹنو کہنے کا بدلہ بھی لے سکے گا۔ اگر آنٹی اس پر اعتراض کرے گی تو وہ بھی اس سے کہہ دے گا، ''مجھے تمھارا یہی نام اچھا لگتا ہے۔'' جیسے وہ اس سے کہا کرتی ہے ''تمھیں ٹنو کہنا مجھے اچھا لگتا ہے۔''

آنٹی ہر سال اپنی سالگرہ دھوم دھام سے منایا کرتی تھی۔ اپنے بچوں کا اور ٹنو کا بھی جنم دن وہ مناتی تو تھی، لیکن اس کے اپنے جنم دن کی شان ہی اور ہوتی تھی۔ اس روز وہ اپنی کئی درجن سہیلیوں کو دعوت دیتی۔ درجنوں قسموں کے کھانے کی چیزیں تیار کراتی۔ اُس روز ٹنو بے چارہ تو کاموں کے سلسلے میں دوڑتے دوڑتے بے حال ہوجاتا تھا۔

اس بار سال گرہ کے موقعے پر اس نے آنٹی سے کہا،

''اب کی دفعہ سال گرہ کا کیک میں تمھیں پیش کروں گا۔''

ٹنو نے جو روپے جمع کررکھے تھے ان کا وہ ایک بڑا کیک بنوالایا۔ کیک لے کر وہ اس وقت گھر میں آیا جب سارے مہمان جمع ہو چکے تھے اور بڑی بے صبری سے کیک کے پہنچنے کا انتظار کررہے تھے۔

کیک کا بند ڈبا میز پر رکھ دیا گیا، آنٹی کی سہیلیاں اسے دیکھنے کے لیے میز کے گرد جمع ہوگئیں۔ ڈبّا کھلا، اور کیک دیکھتے ہی سب عورتیں حیرانی سے چیخ اٹھیں:

''ہیپی برتھ ڈے— بھونچال آنٹی۔''

کیک کے اوپر یہ لکھا دیکھ کر جیسے وہاں سچ مچ بھونچال آگیا۔ آنٹی نے اتنے غصے سے میز پر مُکّا مارا کہ میز گرتے ہوئے بچی اور اس کے ساتھ اس پر رکھا ہوا کیک بھی۔ مہمان عورتوں نے میز کو گرنے سے بچا لیا اور وہ سب زور سے ہنس بھی پڑیں۔ سب نے ہنستے ہنستے مل کر 'بھونچال آنٹی— ہیپی برتھ ڈے ٹو یو' گایا اور آنٹی کو مبارکباد پیش کی۔

آنٹی کے لیے سبھی کے سامنے اب ہنس پڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ٹنّو ابھی تک دروازے کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ آنٹی کو ہنستا دیکھ کر وہ ڈرتے ڈرتے آنٹی کے پاس گیا اور بہت دھیرے سے کہا ''ہیپی برتھ ڈے— بھونچال آنٹی!''

اس کی آنٹی نے اور دوسری عورتوں نے حیران ہوکر ٹنو کی طرف دیکھا۔ مہمان عورتوں کے سامنے آنٹی کی ہمت نہ پڑی کہ وہ ٹنو کو ڈانٹتی۔ وہ بس مسکرا دی اور ٹنو کے منہ میں کیک کا ایک ٹکڑا ٹھونس دیا لیکن دوسرے ہاتھ سے اس نے ٹنو کے خوب صورت بال بھی بگاڑ دیے۔

اُس روز سے ٹنو کی آنٹی کو سب لوگ بھونچال آنٹی ہی کہہ کر پکارتے ہیں، اور وہ خوش مزاج ہونے کی وجہ سے کبھی برا نہیں مانتی۔

■

محمد قمر سلیم

کہانی

جھوٹ سے توبہ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب آج کی طرح ٹی وی، ویڈیو، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ ،موبائل، انٹرنیٹ وغیرہ نہیں تھے۔ بچے جلدی سوتے تھے اور جلدی اٹھتے تھے۔ اسکول جانا، پڑھائی کرنا۔گھر آ کر اسکول اور گھر کے کام کرنا۔اس کے علاوہ اس وقت بچے اپنا زیادہ تر وقت اپنے گھر، محلے اور اسکول میں کھیل کود کر گزارتے تھے۔ ہفتے میں کبھی مداری بندر کا تماشہ تو کبھی بھالو کا تماشہ دکھانے آجاتے تھے۔کبھی کبھی سپیرا بھی سانپ کا تماشہ دکھانے آجاتا تھا۔اس وقت بائسکوپ بہت مشہور تھا۔ہم بچے اس پر ہی کچھ بھی دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔بائسکوپ ایک بند بڑے سے گول ڈبّے کی طرح ہوتا تھا اس میں تین یا چار چھوٹے چھوٹے خانے ہوتے تھے۔خانوں میں شیشے لگے ہوتے تھے۔ان خانوں میں سے بچے جب دیکھتے تھے تو انھیں تاج محل، قطب مینار، لال قلعہ اور دوسری بہت سی چیزیں ، لوگ اور مناظر کی تصویریں دیکھنے کو ملتی تھیں۔تم نے شاید یہ گانا تو سنا ہی ہوگا:

دیکھو دیکھو! بائسکوپ دیکھو،\
دلّی کا قطب مینار دیکھو، بمبئ شہر کی بہار دیکھو!\
دیکھو رے یہ ہے آگرے کا تاج محل،\
گھر بیٹھے سارا سنسار دیکھو!

سال میں ایک یا دو بار نمائش لگتی تھی۔ جو دس پندرہ دن تک رہتی تھی اس میں طرح طرح کے کھیل ہوتے تھے، جھولے ہوتے تھے، جادو ہوتا تھا، موت کا کنواں اور موت کی

چھلانگ۔ موت کے کنوئیں میں موٹر سائکل سوار موٹر سائکل پر طرح طرح کے کرتب کرتا تھا۔ ایسے کرتب ہوتے تھے کہ ہم لوگوں کی اندر کی سانس اندر باہر کی سانس باہر رہ جاتی تھی۔ کرتب اتنے خطرناک ہوتے تھے کہ جان جانے تک کا خطرہ ہوتا تھا۔ نمائش میں ہی موت کی چھلانگ میں ایک آدمی منھ کو کپڑے کے تھیلے سے ڈھک کر اور اس پر آگ لگا کر تقریباً 25 سے 30 فٹ کی اونچائی سے پانی میں کودتا تھا۔ جب وہ آگ لگا کر کودتا تھا، اس وقت ہماری سانسیں رک جاتی تھیں۔ اسی طرح سال میں ایک بار سرکس لگتی تھی تو ہم لوگ دیکھنے جاتے۔ اس زمانے میں آج کی طرح سنیما ہال بھی نہیں تھے۔ پورے شہر میں دو چار سنیما ہال ہی ہوتے تھے جن میں ہر ہفتے یا مہینوں میں فلمیں لگتی تھیں۔ بچوں میں فلمیں دیکھنے کا چلن بھی آج کی طرح نہیں تھا۔ کبھی کبھی بچوں کی فلمیں آتی تھیں تو اسکول یا اپنے بڑوں کے ساتھ ہم لوگ فلم دیکھنے جاتے تھے مگر وہ بھی سال میں ایک بار۔

میرا وطن بریلی تھا لیکن میرے والد کی نوکری دلّی میں تھی اسی لیے میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ دلّی ہی میں رہتا تھا۔ جب گرمیوں میں اسکول کی چھٹیاں ہوتی تھیں تو ہم بریلی جاتے تھے۔ وہاں اپنے چچا اور تایا زاد بہن بھائیوں کے ساتھ خوب مزے کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے میں دسویں کا امتحان دے کر چھٹیوں میں بریلی گیا۔ میں نے اور میرے چچا زاد بھائی نے پروگرام بنایا کہ ہم لوگ فلم دیکھنے جائیں گے۔ اب سوال یہ تھا کیسے جائیں؟ کیونکہ نہ تو ہمارے پاس پیسے تھے اور نہ ہی گھر والے اجازت دیں گے۔ پیسے کہاں سے لائیں اور اجازت کیسے مانگیں۔ ہم لوگ اپنے والدین اور بڑے بہن بھائیوں سے بہت ڈرتے تھے اور بہت عزت و احترام کرتے تھے۔ ہم دونوں بھائی سوچ میں پڑ گئے کہ کیا کریں۔ پھر ہم دونوں نے ایک ہفتے تک روز پیسے جمع کیے تو فلم کی ٹکٹ کے پیسے جمع ہوئے۔ اب دوسرا مرحلہ اجازت حاصل کرنا تھا۔ ہم دونوں نے اپنی اپنی امی کو خوب منایا۔ غرض یہ کہ اجازت بھی مل گئی اور اب باری تھی فلم دیکھنے کی۔

اس وقت فلم کے چار شو ہوتے تھے۔ ہم دونوں نے سوچا کہ ہم تین بجے کا شو دیکھنے جائیں گے تو کوئی زیادہ پوچھ تاچھ نہیں کرے گا۔ گھر کے زیادہ تر لوگ دوپہر میں کھانا کھا کر سو جاتے تھے۔ ہم دونوں کھانا کھا کر گھر سے نکل ہی رہے تھے کہ ہماری پھوپھی نے ہمیں آواز دی، 'تم دونوں یہ ڈول لے کر کہاں جا رہے ہو' (ڈول ایک لمبا گول برتن جس میں ہم دودھ لاتے تھے۔)

'دودھ لینے۔' میں نے کہا

'اس وقت! ابھی تو دو بجے ہیں۔'

'ہاں، وہ ہم لوگ بازار بھی جائیں گے، لوٹنے پر دودھ لے کر آئیں گے۔' میرے بھائی نے کہا۔

'نہیں، تم لوگ کہیں اور جا رہے ہو۔ اچھا تم بازار بعد میں جانا پہلے میرا کام کر دو۔'

'کیا کام ہے۔' میں نے پوچھا۔

وہ بولیں، 'درزی کے یہاں سے میرے کپڑے لا دو۔'

ہم نے کہا، 'بازار سے لوٹتے وقت لے کر آ جائیں گے۔'

'نہیں پہلے میرا کام کر دو، بعد میں بازار جانا۔'

’نہیں ہم ابھی نہیں جائیں گے۔‘
’اتنی جلدی کیا ہے بازار جانے کی۔آخر تم لوگ جا کہاں رہے ہو۔‘
’ہم لوگ وہ...‘
’اچھا تو فلم دیکھنے جا رہے ہو۔‘
’ہاں۔ہم فلم دیکھنے جا رہے ہیں۔‘ہم نے ایک آواز ہو کر کہا۔
’اگر تم نے میرا کام نہیں کیا تو دیکھو۔‘
ہم ان کی دھمکی کی پرواہ کیے بغیر فلم دیکھنے چلے گئے۔
ہم نے پہلی بار اکیلے فلم دیکھی تھی لیکن ایر کولڈ تھیٹر میں بیٹھ کر بہت مزہ آیا۔گرمی بہت تھی اس لیے اور بھی اچھا لگ رہا تھا۔فلم لمبی تھی،ختم ہوتے ہوتے شام ہوگئی۔باہر نکلے تو سورج ڈوب چکا تھا،مغرب کا وقت ہوگیا تھا۔ہم دونوں گھبرا گئے۔ اب ہمارے نام کے قصیدے پڑھے جا رہے ہوں گے۔لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے آگے بڑھے اور جلدی جلدی دودھ کی ڈیری پر پہنچے۔ دیکھا تو دودھ کے ڈول خالی پڑے تھے۔ہم دونوں گوالے کے پاس گئے۔
’بھیّا،آپ نے ہمارا دودھ نہیں دیا‘
وہ سوچ میں پڑ گیا اور بولا،’اب آؤ گے تو دودھ کہاں سے ملے گا۔‘
’ہم لوگ تو دوپہر میں اپنا ڈول رکھ کر گئے تھے اور آپ کو بتایا بھی تھا۔‘
’ہاں!مجھے کچھ یاد تو آ رہا ہے۔‘ گوالا بولا
جب ہم نے دوپہر میں ڈول رکھا تھا اس وقت گوالا سو رہا تھا اور ہم نے ڈول رکھ کر کہا تھا ہمارا دودھ نکال کر رکھ دینا۔ اس نے سوتے میں ہی جواب دیا،ہاں۔ہاں۔
ہم دونوں تو گوالے کے پیچھے پڑ گئے،ہمیں دودھ چاہیے کہیں سے بھی لا کر دو۔اس نے جب ہماری رونی صورتیں دیکھیں تو اسے ترس آ گیا اور نہ جانے کہاں سے اس نے دودھ لا کر دیا لیکن دودھ بہت پتلا تھا۔ ہم دونوں وہ دودھ لے کر جلدی جلدی گھر کی طرف بڑھے۔کہتے ہیں جب انسان پریشان ہوتا ہے تو اسے اللہ یاد آتا ہے۔ہم دونوں کی حالت بھی وہی تھی۔آگے بڑھتے جاتے اور اللہ سے دعائیں مانگتے جاتے،’یا اللہ ہماری پٹائی نہ ہو۔‘
پڑھتے پڑھتے گھر میں گھسے۔جلدی سے ڈول باورچی خانے میں رکھا اور کمرے میں بس قدم رکھنے ہی والے تھے کہ ہماری پھوپھی ہمارے تایا سے مخاطب ہوکر چلائیں،’بھائی صاحب!دیکھو یہ دونوں فلم دیکھ کر آئے ہیں۔‘ فلم دیکھنا اس وقت بہت برا سمجھا جاتا تھا اور پھر ہم تو دسویں جماعت میں تھے جبکہ اس وقت جوان لوگ بھی چھپ کر فلم دیکھنے جاتے تھے۔ ہماری پھوپھی کے چلاّنے پر ہمارے تایا نے ہمیں پکڑ لیا،’کہاں گئے تھے۔‘
میرے بھائی نے کہا،’بازار گئے تھے۔‘
’نہیں نہیں یہ جھوٹ بول رہے ہیں،یہ فلم ہی دیکھنے گئے تھے۔‘ پھوپھی بولیں۔
تایا نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے بھی کہہ دیا بازار گئے تھے۔
’کون سے بازار گئے تھے۔‘ تایا نے پوچھا
ہم دونوں نے جلدی سے کہا،’قطب خانہ۔‘ اور یہ سوچ کر خوش ہونے لگے کہ اب جان چھوٹ جائے گی لیکن اللہ کو

کچھ اور ہی منظور تھا۔ اتفاق کی بات کہ قطب خانے میں جھگڑا ہو گیا تھا اور وہاں کافی تعداد میں پولس تھی۔

میرے تایا بولے، 'اچھا تو آپ دونوں جھگڑے میں شامل تھے۔'

ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور ہم نے کہا 'نہیں نہیں ہم لوگ ادھر نہیں تھے۔'

'پھر کہاں تھے۔'

اس سے پہلے کہ ہم کچھ جواب دیتے ہماری دادی باورچی خانے سے باہر نکلتے ہوئے بولیں، 'دیکھو تو کتنا پانی جیسا دودھ دیا ہے موئے نے۔'

پھر کیا تھا پھوپھی کو اور شے مل گئی، 'میں تو کہہ رہی ہوں دونوں فلم دیکھنے گئے تھے۔ اپنے سامنے دودھ لیا ہوتا تو پانی جیسا نہیں ملتا۔'

اب تو تایا اور غصّے میں آ گئے۔ 'سچ سچ بتا دو کہاں گئے تھے۔' ہم نے بھی ٹھان لی تھی کہ سچ نہیں بتائیں گے۔

ہمارے تایا نے کہا ٹھیک ہے میں گوالے سے پوچھوں گا۔ اس وقت ہمارے تایا نے ہمیں چھوڑ دیا اور باہر نکل گئے۔ ہم نے سوچا جان بچی لاکھوں پائے ،۔ اب تایا رات میں آئیں گے جب تک ہم لوگ سو جائیں گے اور بات آئی گئی ہو جائے گی۔ لیکن یہ کیا، تایا آدھے گھنٹے میں ہی واپس آ گئے اور ہمیں آواز دی۔ ہماری تو جان ہی نکل گئی۔ ڈرتے ڈرتے ان کے پاس گئے۔ وہ بولے سچ سچ بتاؤ فلم دیکھنے گئے تھے۔ ہمارا جواب وہی، 'نہیں۔' ہماری شامت آئی تھی کہ ہماری امی جو پڑوس میں ایک تقریب میں گئی ہوئی تھیں، گھر میں آئیں اور اندر آتے ہی پوچھا، 'کون سی فلم دیکھ کر آئے؟'

اب کاٹو، تو خون نہیں۔ ہم دونوں خاموش۔

پھوپھی بولیں، 'اب جھوٹ کیسے بولو گے۔' امی نے پوچھا ماجرا کیا ہے۔ پھوپھی نے سب روداد سنا دی۔ امی کہنے لگیں جب کہہ کر گئے تھے تو جھوٹ کیوں بول رہے ہو۔ تایا نے بھی وہی سوال داغ دیا، 'کون سی فلم دیکھی'۔ اب ہمارے پاس سچ بولنے کے علاوہ کوئی چارا نہیں تھا۔ میرا بھائی میرا ہاتھ دباتا رہا لیکن میں نے دبی زبان میں کہا، ''شیریں فرہاد'۔ تایا نے ایک زوردار ہاتھ رسید کیا اور بولے شیریں فرہاد دیکھنے گئے تھے۔ پھر دو تین ہاتھ مجھے اور میرے بھائی کو رسید کیے اور سمجھایا، 'بیٹا! فلم دیکھنے سے برا کام ہے، جھوٹ بولنا۔ جب تم اجازت لے کر گئے تھے تو جھوٹ کیوں بول رہے تھے۔ جھوٹ بولنے سے انسان دنیا میں تو رسوا ہوتا ہی ہے۔ اللہ کا بھی گناہ گار ہو جاتا ہے۔ آئندہ جھوٹ مت بولنا کیوں کہ ایک جھوٹ چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں پھر بھی جھوٹ نہیں چھپتا کیوں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ بس اس دن سے ہی ہم نے جھوٹ سے توبہ کر لی۔ کچھ بھی ہو جائے جھوٹ بول کر نہ تو رسوا ہونا ہے نہ ہی اللہ کا گناہ گار بننا ہے۔ دوسرے دن ہماری پھوپھی نے بہت پیار سے ہمیں اپنے پاس بلا کر پیسے دیے اور کہا، 'جاؤ دونوں کلفی لے کر کھا لو کیوں کہ تم نے جھوٹ بولنے سے توبہ کر لی ہے۔'

■

Mohd Qamar Saleem
Flat No. 3, Atmashanti CHS,
Plot No. 33, Sector-3, Vashi
Navi Mumbai-400703 (Maharashtra)
Mob.:09322645061

ملکہ تبسم

کہانی

مدد ایک انمول جوہر

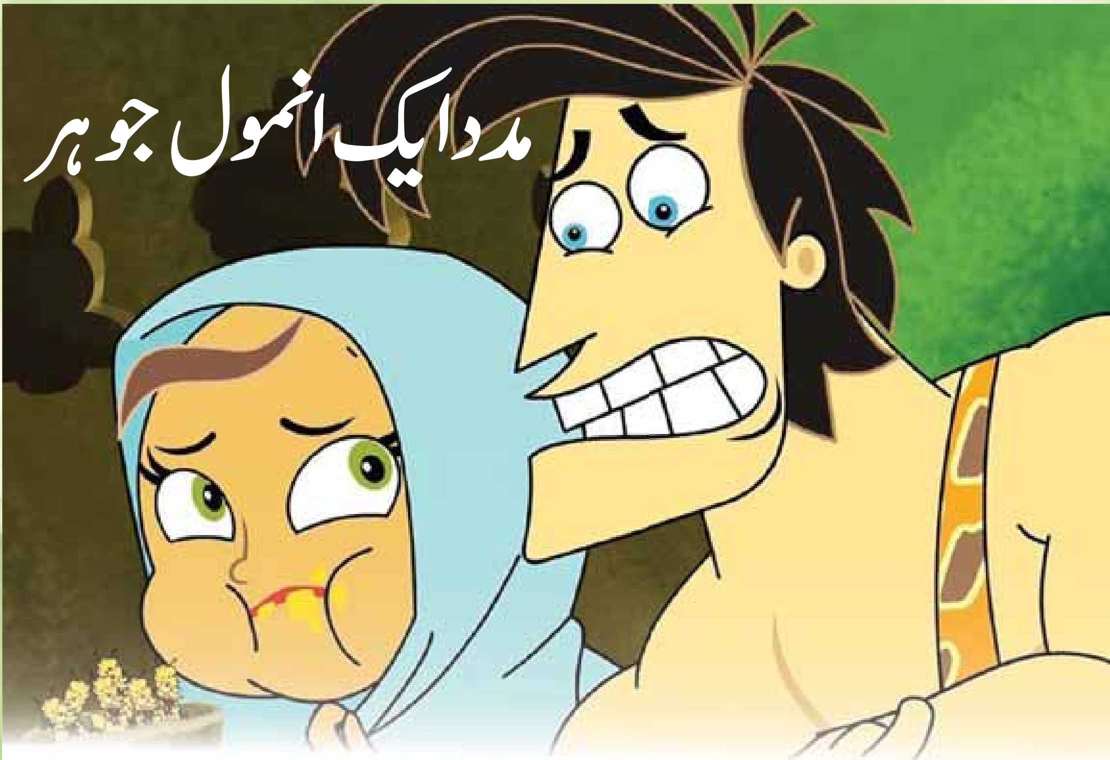

12 سالہ ننھی زویا کی جب آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو اسکول یونیفارم میں ملبوس ایک گھنے جنگل میں پایا۔ کاندھے پر اسکول بیگ لٹکائے، لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ زویا کے معصوم چہرے پر ڈر کی کیفیت طاری تھی۔ جنگل کے اندھیرے پن اور سناٹے سے اس کا دل لرز اٹھتا۔ ڈر کے مارے آنسوؤں کے قطرے آنکھوں سے گالوں پر ٹپکنے لگے۔ ایک لمبے وقفے تک زویا اپنی جگہ پر یونہی ساکت رہی۔ وہ یہ سمجھ نہیں پارہی تھی کہ کس طرح اس گھنے جنگل سے باہر نکلے۔ لہٰذا کچھ دیر کے بعد حوصلہ اکٹھا کر کے اس نے دبے پاؤں آگے بڑھنا شروع کیا۔ اس نے راہ میں چلتے چلتے آواز لگائی کہ شاید کوئی اس کی مدد کے لیے سامنے آئے لیکن زویا کی ہر کوشش ناکام ثابت ہورہی تھی۔ اس کا سہا ہوا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ آخرکار وہ اس سنسان راستے پر آگے بڑھتی گئی۔ اسے ہر وقت یہ خدشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی جنگلی جانور اس پر حملہ نہ کردے، لیکن زویا کے پاس آگے بڑھتے رہنے کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

چلتے چلتے اس کی نظر دوری پر واقع ایک سفید چیز پر پڑی۔ دیکھنے پر ایسا معلوم ہورہا تھا کہ روئی کا ایک چھوٹا سا گولہ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اڑ کر دور آگرا۔ زویا نے اپنا قدم اس سفید چیز کی طرف بڑھانا شروع کیا۔ نزدیک پہنچ کر زویا نے دیکھا کہ وہ سفید چیز ایک خوبصورت کبوتر تھا جو کسی کے ظلم کا شکار تھا۔ اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ زویا کا غمزدہ

دل کبوتر کو اس حال میں دیکھ کر اور بھی مغموم ہو گیا۔ اس نے بڑی شفقت سے اس کبوتر کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا، اپنے اسکول بیگ سے پانی کا بوتل باہر نکالا اور اپنے دوسرے ہاتھ سے کبوتر کو پانی پلانے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ دیر تک تو کبوتر نے کوئی حرکت نہیں کی لیکن زویا کی کوشش جاری تھی۔ تھوڑی دیر بعد کبوتر نے پانی پیا اور اپنے پنکھ ہلائے۔ پھر زویا نے اپنے بیگ سے ٹفن باہر نکالا اور اس میں موجود بچے ہوئے روٹی کے ٹکڑے کبوتر کے سامنے رکھ دیے۔ کچھ وقفے بعد کبوتر کی حالت میں سدھار ہوا اور وہ اڑ کر زویا کے بازو پر جا بیٹھا۔ زویا بہت خوش ہوئی کہ اس کی کوشش رنگ لائی۔ اب زویا اکیلی نہیں تھی۔ ایک ننھا سا خوبصورت پرندہ اس کا دوست بن چکا تھا۔ وہ کبوتر کے ساتھ سنسان راہوں پر آگے بڑھتے گئی۔ اس دوران دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب تک منزل کا کوئی پتہ نہیں تھا لیکن زویا نے امید کا دامن تھامے رکھا۔ آگے چلتے چلتے جب وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر پہنچی تو کبوتر نے ایسے حرکت کی مانو کہ وہ اس جگہ کو جانتا تھا۔ وہ زویا کے بازو پر سے اٹھ کر اڑنے لگا اور ایک غار کی طرف اشارہ کرنے لگا جہاں سے تیز روشنی آ رہی تھی۔ روشنی دیکھ کر زویا کا حوصلہ اور مضبوط ہوا۔ کبوتر اسے راستہ دکھاتا رہا اور زویا کبوتر کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ غار کے دروازے پر جا کر کبوتر رک گیا۔ زویا نے جھانک کر اندر دیکھا تو سوائے ایک لمبے راستے کے اور کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہ غار کے اندر داخل ہوگئی اور آگے بڑھنے لگی۔ کبوتر واپس پھر زویا کے بازو پر آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دور جا کر زویا کی نظر شیشے کے بنے ایک قفس پر پڑی۔ نزدیک جا کر دیکھا تو وہ حیران رہ گئی۔ اس قفس میں ایک چھوٹی سی پری قید تھی۔ زویا کو دیکھ کر وہ پری بہت خوش ہوئی۔ پری زویا سے اسے آزاد کرنے کی منتیں کرنے لگی۔ زویا نے پری سے طلب کیا کہ اسے کس نے قید کیا۔ پری نے پورا ماجرا کہہ سنایا۔ پری نے کہا، اس غار میں ایک جادوگر رہتا تھا جس نے مجھے قید کیا ہے۔ وہ اس غار میں معصوم پرندوں اور جانوروں کے ساتھ حیوان جیسا سلوک کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ان اعمال کے ذریعے اس کی جادوئی طاقت میں اور بھی اضافہ ہوگا ایک دن میں نے اس کی حیوانیت کا یہ تماشہ دیکھ لیا اور اس کی مخالفت کرنے لگی تو اس نے اپنی جادوئی طاقت سے مجھے یہاں قید کر دیا۔ یہ تمھارے بازو پر جو کبوتر بیٹھا ہے یہ میرا ہے، جو کسی طرح اس حیوان کے چنگل سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ زویا نے کہا، لیکن یہاں آپ کے سوا کوئی اور موجود نہیں۔ وہ جادوگر کہاں گیا؟ پری نے مسکراتے ہوئے کہا، اس ظالم کو قدرت نے اس کے کیے کی سزا دے دی ہے۔ جب وہ مجھے یہاں قید کر کے پرندوں کو پکڑنے باہر نکلا تو زوروں کا طوفان آیا، بجلیاں کڑکنے لگیں اور ایک بجلی کا شکار ہو کر مر گیا۔ زویا نے پری سے جاننا چاہا کہ وہ کس طرح اسے اس قید سے آزاد کرائے۔ پری نے غار کی دیوار پر لٹکی ایک چھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ چھڑی ہی اس کے آزاد ہونے کی چابی ہے۔ زویا کبوتر کی مدد سے کسی طرح وہ چھڑی نکالنے میں کامیاب ہوئی اور پری کو آزاد کیا۔ آزاد ہوتے ہی پری ایک خوبصورت، حسین و جمیل پری میں تبدیل ہو گئی۔ پری نے زویا کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اس جادوگر کے طلسم سے آزاد کرایا۔ پری نے زویا سے پوچھا کہ وہ اس

گھنے جنگل میں کس طرح پہنچی۔ زویا نے پوری کہانی سنا ڈالی۔ زویا نے کہا کہ اسکول سے گھر واپس لوٹتے وقت ایک عجیب سے جانور کو دیکھ کر وہ بے ہوش ہوگئی اور جب اس کی آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو اس جنگل میں پایا۔ پری نے کہا کہ ضرور یہ سارا کھیل اس جادوگر نے رچا ہوگا۔ پری نے کہا کہ وہ خود زویا کو اس کے گھر پہنچائے گی۔ پری، زویا اور کبوتر کے ساتھ وہاں سے اڑ گئی اور زویا کو اس کے گھر پہنچا دیا۔ زور نے بھی پری کا شکریہ ادا کیا اور پری سے گزارش کی کہ وہ ہمیشہ اس سے ملنے آیا کرے۔ زویا خوشی خوشی اپنے گھر لوٹ گئی اور پری کبوتر کے ساتھ اپنے گھر کی طرف اڑ گئی۔

پیارے بچو! مدد ایک انمول جوہر ہے جس کی روشنی سے کسی کی زندگی جگمگا سکتی ہے۔ لہٰذا جب کبھی بھی آپ کسی کو پریشانی میں دیکھو تو اس کی ضرور مدد کرو۔ جس طرح زویا نے کبوتر اور پری کی مدد کی اور اسے اس کا انعام بھی ملا۔ آپ کی مدد سے کسی کی مشکلیں آسان ہوجائیں گی اور آپ کو دلی سکون بھی ملے گا۔

کرو گے مدد تو خوش ہوگا بندہ بھی اور خدا بھی
ملیں گی دعائیں لوگوں کی، اور پہنچے گا فائدہ بھی

■

Malka Tabassum
Do/ Md Aslam
Rail Par, O.K. Road, R.C.H. Hospital
Asansol - 713302 (WB)

پانچویں قسط

اردو زبان کا جادو

پیارے دوستو! 'بچوں کی دنیا' آپ سب کا اپنا رسالہ ہے۔ ہماری کوشش رہتی ہے کہ رسالے میں زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور کارآمد تحریریں شائع کی جائیں۔ اِس رسالے کی اشاعت کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی زبان اردو کو فروغ دیں اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس زبان کو سیکھیں۔ کسی بھی زبان کو سیکھنے کے لیے اگر اس میں کھیل اور مزے کو شامل کرلیا جائے تو سیکھنے میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ ہم نے اردو زبان کے لسانی کھیلوں پر مشتمل ایک سلسلہ شروع کیا ہے جو قومی اردو کونسل سے شائع کتاب 'اردو زبان کا جادو' سے لیا گیا ہے۔ امید ہے کہ آپ سب اس سلسلے کو پسند کریں گے۔ (ادارہ)

اِس ذہنی آزمائش کے جوابات اِسی شمارے میں آپ کو مل جائیں گے۔

(5) پہچانو تو جانیں

مقصد : لکھنے کے دوران ہاتھ کی حرکات سے حروف کی پہچان۔

ہدایت : جدول میں نقطوں میں دس حروف لکھے گئے ہیں اور چند الفاظ بھی دیے گئے ہیں۔
ہر حرف کے لیے اس حرف والے ایک لفظ کی نشاندہی کیجیے۔

مثلاً: نام حرف ا کے لیے

کھلاڑی : 1 وقت : 5 منٹ نمبر : 10

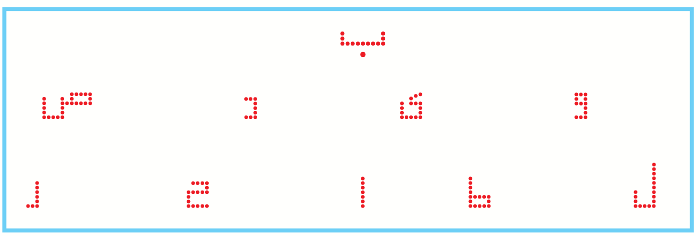

مثال : بن طعنہ صنم الف رنگ

خال ہانڈی حسن دن آنسو

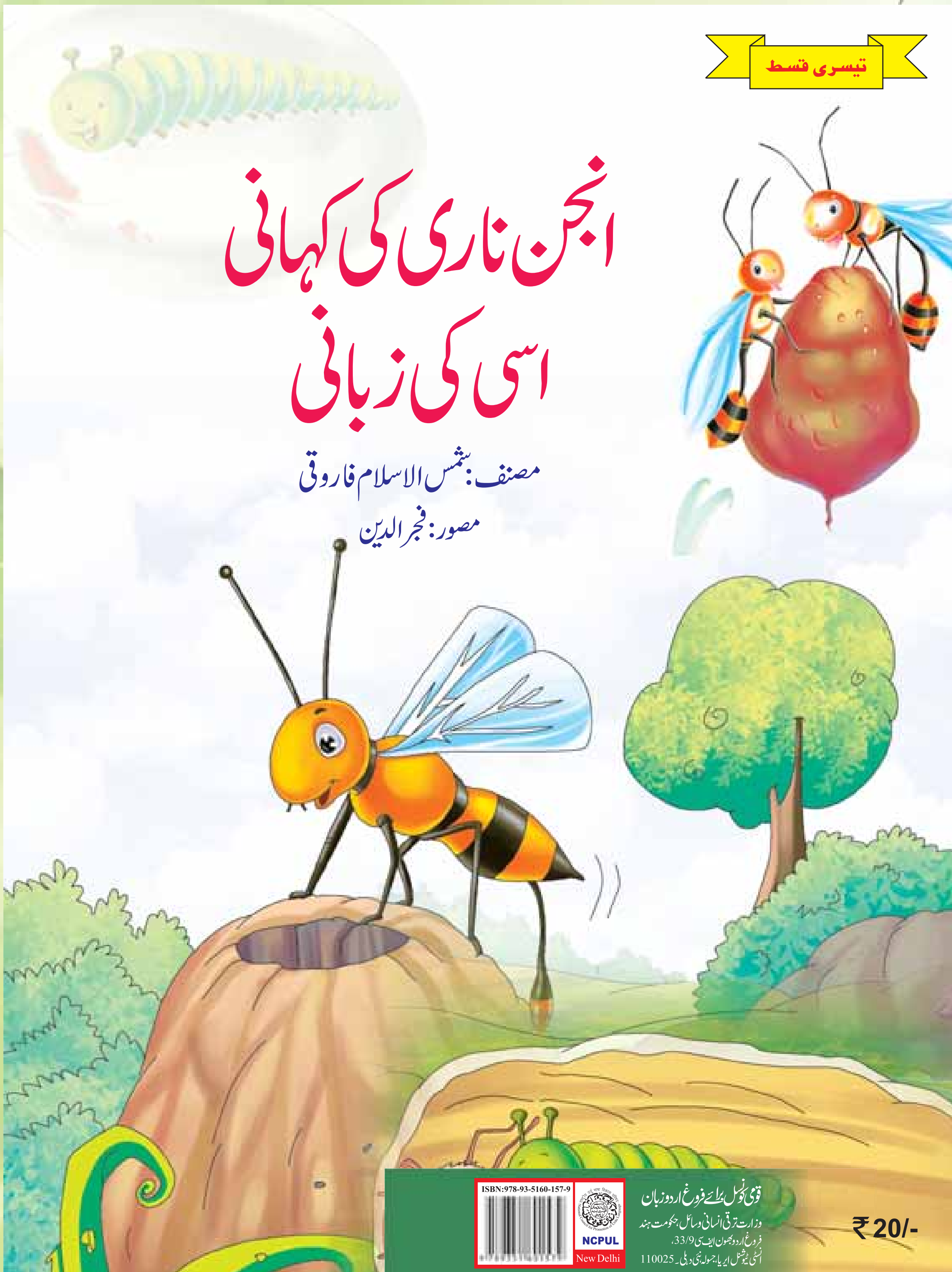

تیسری قسط

انجن ناری کی کہانی اسی کی زبانی

مصنف: شمس الاسلام فاروقی

مصور: فجر الدین

ISBN:978-93-5160-157-9
NCPUL
New Delhi
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون ایف سی 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

₹ 20/-

ایک دن جو نیند ٹوٹی تو اپنا روپ ہی بدلا ہوا پایا۔ میرا جسم بڑا ہو کر خوبصورت ہو گیا تھا۔ سر پر دو عدد ایریَل نکل آئے تھے جو چاروں طرف کی خبریں دیتے تھے۔ پَر اور پیر پورے بن گئے تھے مگر خول کی وجہ سے ایریَل، پَر اور پیر جسم کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ جسم اب اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ کوٹھری چھوٹی لگنے لگی تھی۔ اپنے خول اور اس کوٹھری سے اب مجھے الجھن ہونے لگی تھی۔

الجھن زیادہ بڑھی تو میں نے پہلے تو اپنا خول کاٹا اور پھر کوٹھری کی دیوار توڑ کر باہر نکل گئی۔ باہر کی دنیا تو ایک دم نرالی تھی۔ باہر کی چمکتی روشنی بہت بھلی لگی۔ میں اپنی کوٹھری سے نکل کر اس کی چھت پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں میرے ایرَل تن گئے اور پَر اور پیر دونوں پھیل گئے۔ میں نے اپنے پیروں سے ایک جست بھری اور پروں کو پھیلا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں تو کھلی ہوا میں تیرنے لگی۔ اس وقت سچ مچ مجھے خود پر بہت رشک ہو رہا تھا۔ میری تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ کہاں کوٹھری میں بند بدصورت لچلچا سا جسم اور کہاں کھلی ہوا میں لہراتی خوبصورت انجن ناری۔

باہر کی دنیا تو سچ مچ بہت خوبصورت تھی۔ میں نے اپنے گھر کو دیکھا تو بڑی حیرت ہوئی۔ وہ مٹی کا بنا ہوا تھا اور اسے ایک مکان کی دیوار پر بنایا گیا تھا۔ میں سوچنے لگی اِسے کس نے بنایا ہوگا اور پھر مجھے اس کے اندر کیوں بند کر دیا۔ میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ سامنے کی دیوار پر نظر پڑی۔ پھر تو میری حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ وہاں بالکل میری شکل کی ایک انجن ناری تھی جو مٹی سے ویسی ہی کوٹھری بنا رہی تھی۔ میں اڑ کر اس کے پاس گئی تا کہ اس سے پوچھوں کہ وہ کون ہے اور کیا کر رہی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ بتا سکے کہ میری کوٹھری کس نے بنائی تھی اور مجھے کیوں اس کے اندر بند کیا تھا۔

جاری........

پانچویں قسط

بے زبان ساتھی

وکیل نجیب

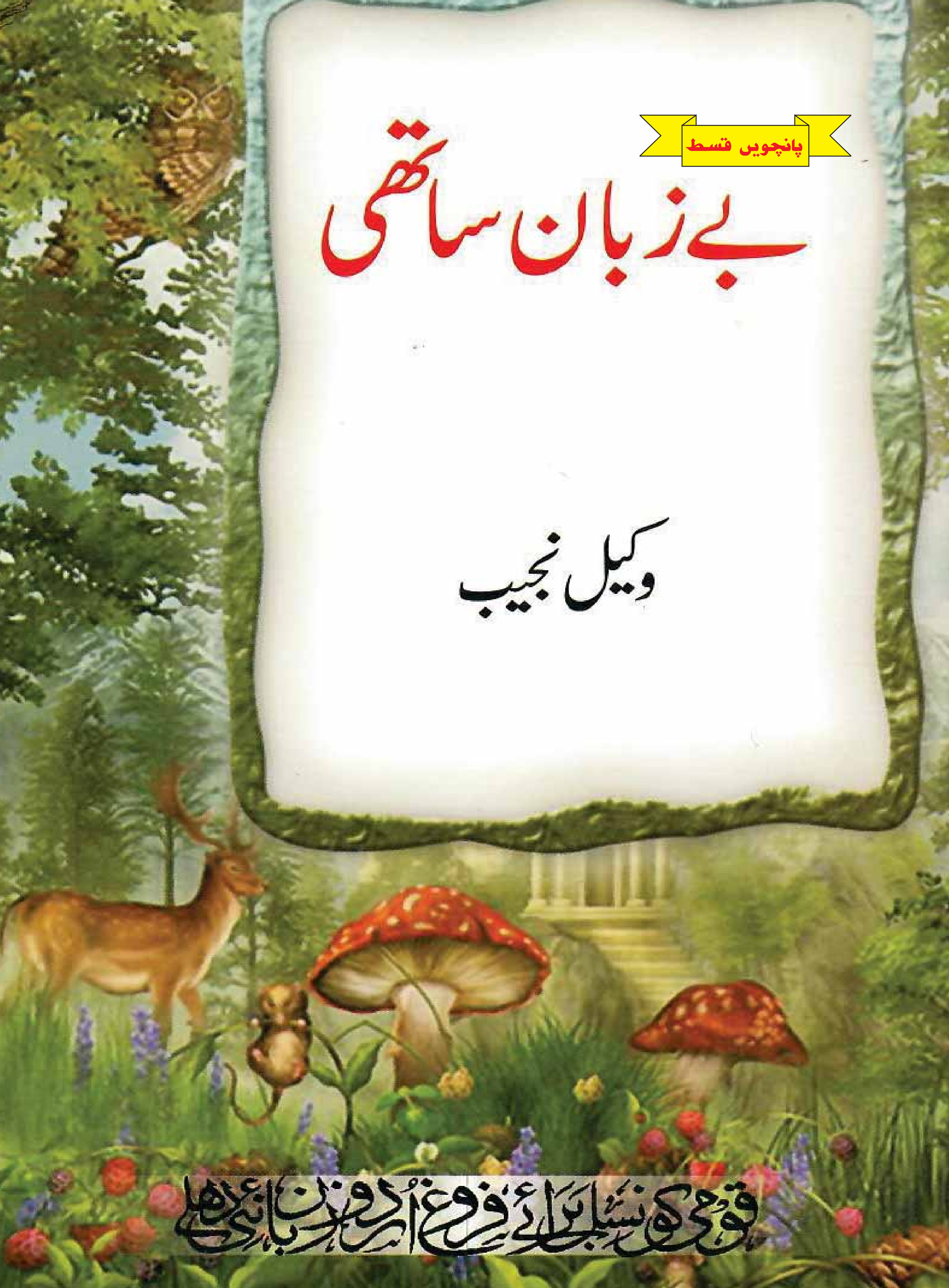

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

قسط وار ناول

پیارے دوستو! ابھی تک آپ نے پڑھا کہ ایک گاؤں میں خدیجہ نام کی ایک غریب عورت رہتی تھی۔ اُس کا ایک بیٹا جنید تھا۔ جنید کے گاؤں پر ڈاکوؤں نے حملہ کردیا اور اس کی ماں کو مار دیا۔ جنید نے اس حادثے کے بعد گاؤں چھوڑ دیا اور سفر پر روانہ ہوگیا۔ وہ ایک جنگل میں پہنچتا ہے جہاں اسے ایک بزرگ آدمی ملتا ہے۔ بوڑھے آدمی نے جنید کو کھانا دیا۔ جنید نے اپنے کھانے میں سے تھوڑا سا حصہ وہاں کھڑے ایک کتے کو بھی کھلا دیا۔ جنید پھر جنگل کا رخ کرتا ہے۔ وہ کتا بھی اس کے ساتھ چل پڑتا ہے جس کو جنید نے کھانا کھلایا تھا۔ جنگل میں ایک گھوڑے کو جنگلی جھاڑیوں میں پھنسا ہوا دیکھ کر جنید اور کتے نے اس گھوڑے کی مدد کی۔ گھوڑا بھی اب جنید کا ساتھی بن گیا۔ کچھ دور چلنے پر جنید کو ایک تلوار ملتی ہے۔ یہ تینوں لوگ جنگل کے راستے پر بڑھتے جاتے ہیں۔ آگے ایک ندی پر جنید پانی پینے کے لیے رکا۔ اسی درمیان پیچھے سے ایک خونخوار شیر کے دہاڑنے کی آواز آئی۔ شیر جنید پر حملہ کرنے ہی والا تھا کہ کتے نے شیر پر حملہ کردیا لیکن بے چارہ کتا بے موت مارا گیا۔ جنید نے تلوار سے شیر کو مار گرایا۔ آگے کے سفر میں جنید کو ایک زخمی باز ملا جس کی مرہم پٹی کرنے کے بعد جنید نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ جنگل سے گزر کر ایک میدانی علاقے میں پہنچنے پر جنید کو ایک بوڑھا بیمار مداری ملتا ہے۔ جنید نے اس بوڑھے مداری کی مدد کی اور اسے دوا لاکر دی۔ بوڑھے مداری کو جنید اپنے گھر پر ہی روک لیتا ہے۔ جنید اپنے ساتھ گزرے واقعات سناتا ہے جسے سن کر بوڑھا، جنید کو بادشاہ کے دربار میں لے جاتا ہے۔ بادشاہ نے گھوڑا اور تلوار پہچان لی کہ یہ اس کے شہزادے کی ہے۔ بادشاہ اور پورا شہر سوگ میں ڈوب گیا کہ شہزادے کو جنگل میں کسی جنگلی جانور نے مار دیا اور اس کا گھوڑا اور تلوار جنید کو ملے تھے۔ دربار سے واپس آکر جنید بوڑھے مداری اور اس کے بندر کے ساتھ رہنے لگا اور کھیل تماشے دکھانے لگا۔ دو مہینوں کے بعد بوڑھے مداری کی موت ہوجاتی ہے۔ اب جنید ہی بوڑھے مداری کا وارث تھا اور وہ اکیلا بندر اور باز کے ساتھ تماشے دکھاتا اور جو بھی ملتا اس میں گزر بسر کرتا۔

ایک دن اُس نے بازار میں اعلان سنا کہ ملکہ شہزادے کی موت کی خبر سن کر بہت بیمار ہوگئی ہے اور اس کا علاج زہریلی پہاڑی سے کندن بوٹی لاکر ہی کیا جاسکتا ہے۔ جنید یہ سن کر زہریلی پہاڑی کے سفر پر نکلنے کی ٹھان لیتا ہے۔ جنید راج محل میں جاکر راجہ کو خبر دیتا ہے کہ وہ کندن بوٹی لانے جارہا ہے۔ بادشاہ جنید کو اس خطرناک سفر پر جانے سے روکتا ہے لیکن جنید اپنے دوستوں بندر اور باز کو لے کر اس خطرناک سفر پر نکل پڑتا ہے۔ چلتے چلتے جنید ایک اونچے پہاڑ کے پاس پہنچا جس کی گہرائی میں ایک گہرا دریا بہہ رہا تھا۔ باز اور بندر کی مدد سے وہ لوہے کے تار کے سہارے پہاڑ پر پہنچتا ہے اور وہاں سانپوں اور اژدہے سے مقابلے کے بعد کندن بوٹی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ واپسی پر جنید سے دو ڈاکوؤں کی ملاقات ہوتی ہے اور وہ کندن بوٹی چھین کر فرار ہوجاتے ہیں لیکن جنید اپنے دوستوں باز اور بندر کی مدد سے کندن بوٹی دوبارہ حاصل کرلیتا ہے اور راجہ کے حوالے کرنے کے لیے واپسی کے سفر پر نکل پڑتا ہے۔ اب آگے...

کھانا کھالینے کے بعد جنید وہاں سے اٹھا اور سیدھا جھرنے پر آیا اور منہ ہاتھ دھویا اور پانی پینے لگا۔ پانی پی کر وہ بیٹھا ہی تھا کہ جھرنے کے دوسرے کنارے اسے ایک آدمی بالٹی میں پانی لے کر جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے سوچا کہ اس ویرانے

میں یہ آدمی پانی لے کر کہاں جا رہا ہے۔ اس کے دل میں معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوا اور وہ آہستہ آہستہ خاموشی سے اس کے پیچھے لگ گیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد وہ آدمی چٹانوں کے بیچوں بیچ ایک غار میں داخل ہوا۔ غار کچھ اس انداز سے بنا ہوا تھا کہ بظاہر نظر نہیں آتا تھا لیکن سامنے کی چٹان کو پار کرنے کے بعد وہ دکھائی دیتا تھا۔ کافی دور تک آہستہ آہستہ جانے کے بعد وہ غار ایک بڑے سے ہال میں جا کر ختم ہو گیا۔ جیسے ہی اس نے ہال میں جھانک کر دیکھا تو اسے وہاں پر چند ڈاکو لیٹے ہوئے دکھائی دیے۔ جیسے ہی اس نے ڈاکوؤں کو دیکھا تو وہ تیزی سے پلٹا اور وہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کی لیکن ابھی اس نے غار کا آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ اچانک سامنے سے خطرناک شکل کا ڈاکو آ گیا اور اس نے جنید کو دیکھا تو اسے پکڑ کر اندر لے آیا اور سردار سے کہا ''سردار! یہ چھوکرا سرنگ سے واپس آ رہا تھا۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہاں تک کیسے پہنچ گیا۔''

ڈاکوؤں کے سردار نے ڈانٹ کر پوچھا ''کیوں رے کون ہے تو اور یہاں کیسے آیا؟''

جنید نے کہا ''میں ایک مسافر ہوں، راستہ بھول گیا اور اس طرف چلا آیا۔''

ایک ڈاکو نے کہا: سردار یہ مجھے جاسوس معلوم ہوتا ہے اور اڈّے کا پتہ چلا کر یہاں سے جا رہا تھا۔ اپنے دو ساتھی سانگو اور شیرا بھی صبح سے گئے ہیں، ابھی تک واپس نہیں آئے ہو سکتا ہے۔ اسی نے انھیں گرفتار کروا دیا ہو۔

یہ سن کر ڈاکوؤں کا سردار غصہ سے آگ بگولہ ہو گیا اور اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ: اسے باندھ دو۔ چنانچہ اسے ایک رسّی سے باندھ دیا گیا اور اس کو ڈاکوؤں نے چاروں طرف سے لات گھونسے مارنے شروع کر دیے اور اپنے ساتھیوں کا پتہ پوچھنے لگے لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار نے بعد میں آنے والے ڈاکو سے پوچھا ''ہاں تو گوموتو ہیرا گڑھ سے کیا خبر لایا ہے۔''

''سردار ہیرا گڑھ کے زمیندار کی لڑکی کی آج شادی ہے اور جہیز میں وہ لاکھوں روپے کے زیورات اور سامان دے رہا ہے۔ بارات آ چکی ہے اور شام کو روانگی ہوگی۔ اگر ابھی ہم حملہ کر دیں تو لاکھوں روپے کا سامان ہاتھ آ جائے گا۔''

یہ سن کر سرادر کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں، اس نے اسی وقت تمام ڈاکوؤں کو تیاری کا حکم دیا۔ جلدی جلدی سب نے اپنی تلواریں اور بھالے لیے اور اپنا اپنا گھوڑا سنبھال کر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

جاتے جاتے ڈاکوؤں کے سردار نے جنید سے کہا ''چھوکرے شام میں ہم آئیں گے۔ اگر تو نے سب کچھ سچ سچ اگل دیا تو ٹھیک ہے ورنہ تیری بوٹی بوٹی کر کے جنگل کے جانوروں کو کھلا دیں گے۔ انھوں نے بہت دنوں سے انسانی گوشت کا مزہ نہیں چکھا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ سب کے سب غار کے راستے نکل گئے۔

اُدھر جنید کے ہاتھ اور پیر بندھے ہوئے تھے اور وہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ نہ تو کھڑا ہو سکتا تھا اور نہ ہی چل سکتا تھا۔ اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بیکار اسی آدمی کے پیچھے اس غار تک آ گیا۔ اس کے دونوں بے زبان ساتھی اس سے کافی فاصلے پر تھے۔ اگر وہ چیختا چلاتا بھی تو اس کی آواز ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اسے اپنی بے بسی اور بے چارگی پر بڑا افسوس

ہوا۔ اس نے سوچا کہ اگر رینگتا ہوا بھی وہ چلے تو اس غار کو نہیں پار سکتا۔ اس بری طرح سے اس کے ہاتھ اور پیر بندھے ہوئے تھے۔

ادھر باز اور بندر کندن بوٹی کے لوٹے کے پاس بہت دیر تک بیٹھے رہے اور جنید واپس نہیں آیا تو بندر نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر اُسی سمت کو اچھلتا ہوا چلا جدھر جنید گیا تھا۔ باز نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی پنجوں میں کندن بوٹی کے لوٹے کو دبوچ کر ہوا میں اڑتا ہوا چکر لگانے لگا۔ آخر بندر کسی طرح غار کے اندر داخل ہوا اور بہت جلد دونوں اس ہال میں پہنچ گئے جہاں جنید پڑا ہوا تھا۔ جب اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو دیکھا تو اسے کچھ اطمینان ہوا۔ جنید نے بندر کو رسی دانتوں سے کاٹنے کا اشارہ کیا۔ بندر نے بہت کوشش کی لیکن رسّی نہیں کٹ سکی، جنید بھی پریشان ہوگیا اور بندر بھی تھک گیا۔ آخر جنید کو ہال کی دیوار پر لٹکی ہوئی ایک تلوار دکھائی دی۔ جنید نے باز کو اشارہ کیا، اور وہ اڑتا ہوا گیا اور اس نے تلوار کو اس کے قریب لاکر رکھ دیا۔ کسی طرح جنید کِھسکتا کِھسکتا ہال کی دیوار تک پہنچا۔ اپنے ساتھ تلوار بھی کھینچتا ہوا لے کر گیا۔ وہاں وہ کسی طرح دیوار کے سہارے تلوار کھڑی کر کے اس کی دھار پر اپنے بندھے ہوئے ہاتھ کی رسّی رگڑنے لگا۔ تقریباً پندرہ منٹ کی متواتر کوشش کے بعد ہاتھوں کی رسی کٹ گئی۔ پھر اس نے پیروں کی رسی اسی تلوار سے کاٹی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں بری طرح شل ہوگئے تھے۔ بہرحال اس نے اپنی تکلیف کی پروا نہیں کی اور کندن بوٹی کا لوٹا اٹھایا اور غار کے دہانے کی طرف بڑھنے لگا لیکن ابھی اس نے آدھا راستہ ہی پار کیا تھا کہ اسے دوسرے کنارے سے ایک آدمی آہستہ آہستہ غار کے اندر داخل ہوتا ہوا نظر آیا۔ جنید نے اس آدمی کو اندر آتے دیکھا تو سمجھا کہ شاید ڈاکو واپس آگئے ہیں۔ اب اسے اپنی زندگی خطرے میں نظر آئی، وہ تیزی سے پیچھے پلٹا اور تلوار اٹھالی اور

ہال کے ایک سمت ایک کٹی ہوئی چٹان تھی۔ وہاں تھوڑا اندھیرا تھا، اسی اندھیرے میں بندر اور باز کو لے کر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ وہی ڈاکو جس نے اس سے لال پہاڑی پر کندن بوٹی کا لوٹا چھینا تھا، باز اور بندر جس سے لوٹا چھین کر واپس لائے تھے، آہستہ آہستہ غار کے اندر داخل ہوا۔ ناک سے خون اب بھی بہہ رہا تھا۔ سر اور پیشانی پر چوٹ کے نشانات موجود تھے، بندر اور باز کے حملے سے وہ زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا تھا، ہوش میں آنے کے بعد وہ سیدھا اپنے اڈّے کی طرف آیا تھا۔ یہاں آ کر اس نے دیکھا کہ اس کے تمام ساتھی کہیں گئے ہوئے ہیں۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ غار میں کوئی نہیں ہے تو وہ جلدی جلدی اس کونے کی طرف بڑھا جہاں جنید چھپا ہوا تھا، ایک لمحہ کے لیے جنید نے سمجھا کہ ڈاکو نے اسے دیکھ لیا ہے۔ جنید نے مضبوطی سے تلوار اپنے ہاتھ میں پکڑ لی اور سوچ لیا کہ اگر وہ اِدھر آیا تو تلوار سے اس پر حملہ کر دے گا۔ جہاں جنید چھپا ہوا تھا وہیں پتھر کی چٹان سے لگا ہوا لوہے کا ایک بڑا صندوق رکھا ہوا تھا۔ اس صندوق کے قریب آ کر وہ رک گیا۔ اس میں ایک تالا لگا ہوا تھا، اس نے تالے کو ہاتھ سے ہلا کر دیکھا۔ کافی مضبوط تالا تھا، وہیں ایک طرف ایک لوہے کی سلاخ پڑی ہوئی تھی، اس کی مدد سے اس نے تالا توڑ دیا۔ اس نے صندوق کھولا تو سونے چاندی کے زیورات اور سکے چمک رہے تھے۔ طرح طرح کے ہیرے جواہرات بھی تھے۔ اس کے بعد اناج کی ایک خالی بوری اس نے اٹھا لی اور صندوق کے تمام زیورات اس بوری کے اندر بھرنے لگا۔ جنید اندھیرے میں کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اچانک جنید کو انھیں زیورات میں اپنی ماں کی چوڑیاں بھی دکھائی دیں، جیسے ہی ان چوڑیوں کو جنید نے دیکھا اس کی آنکھوں میں اس کی ماں کا معصوم چہرہ گھومنے لگا اور وہ سمجھ گیا کہ انھیں ڈاکوؤں نے اس کی ماں کا قتل کیا ہے۔ ایک

دم غصے سے اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور تلوار لے کر چٹان کے پیچھے سے باہر نکل آیا اور ڈاکو پر حملہ کر دیا مگر ڈاکو نے اسے چٹان کے پیچھے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ تیزی سے ایک طرف جھک گیا اور تلوار لوہے کی پیٹی پر پڑی۔ تب تک ڈاکو نے لوہے کی وہی سلاخ اٹھالی جس سے اس نے تالا توڑا تھا اور اس سے پہلے کہ جنید دوسرا وار کرتا اس نے اپنی سلاخ تیزی سے گھمائی اور سلاخ سیدھی جا کر تلوار پر لگی۔ تلوار جنید کے ہاتھ سے گر پڑی اور وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے لوہے کی پیٹی کی طرف بڑھا لیکن تب تک ڈاکو کی سلاخ بلند ہو چکی تھی اور سلاخ کا وار سیدھا جنید کے سر پر پڑنے والا تھا، تبھی باز نے اپنے پَر پھڑ پھڑائے اور اس کے سلاخ والے ہاتھ پر اپنی چونچ ماری۔ سلاخ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اسی وقت بندر نے ایک چھلانگ لگائی اور زوردار ہاتھ اس کی ناک پر مارا۔ ڈاکو نے بندر اور باز کو دیکھا تو ڈر گیا اور جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ اپنے زخمی سر پر رکھ لیے۔ اتنے میں جنید نے سلاخ اٹھائی اور اس پر ٹوٹ پڑا، سلاخ پوری طاقت سے اس کے سر پر پڑی اور وہ پکے فرش پر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔

جنید نے بڑھ کر صندوق میں سے وہ دونوں سونے کی چوڑیاں اٹھالیں اور اسے اپنی آنکھوں سے لگایا، چوما اور اپنی جیب میں رکھ لیا پھر اس نے جلدی جلدی لوہے کی صندوق کے تمام زیورات تھیلے میں بھر لیے اور رسّی سے اُسے اچھی طرح باندھ لیا اور تیزی سے غار سے نکلا۔ کندن بوٹی کا لوٹا اس نے کمر سے باندھ لیا۔

غار سے باہر نکل کر اس جگہ آیا جہاں اس کا تھیلا رکھا ہوا تھا۔ اس نے تھیلے میں سے لوہے کا باریک تار نکالا اور پھر غار کے اندر گیا اور بے ہوش ڈاکو کے ہاتھ پیر اچھی طرح تار سے باندھ دیے اور پھر غار سے نکل کر باہر چلا آیا۔

آج تیسرا دن بھی ختم ہو گیا تھا اور کل راجہ کے دربار میں جنید کا پہنچنا ضروری تھا مگر جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی ماں کو انھیں ڈاکوؤں نے قتل کیا ہے، اسی وقت سے اس کے دل میں بدلہ لینے کی آگ سلگ رہی تھی۔ جب غار سے نکل کر شہر کی طرف چلا تو راستے میں گھوڑوں کے کھُروں کے نشانوں سے معلوم ہوا کہ وہ اسی راستے سے زمیندار کو لوٹنے کے لیے گئے ہیں، اس نے یہ بھی سوچا کہ اسی راستے سے وہ واپس آئیں گے۔ راستے میں سوچتا رہا کہ ان سے اپنی ماں کے قتل کا کس طرح بدلہ لے۔ وہ بہت دور جب نکل گیا تو اسے ایک جنگل سا ملا جس میں اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں اور اونچے اونچے مضبوط درخت تھے۔ انھیں کے بیچ سے راستہ گیا تھا۔ یہ جگہ دیکھ کر ڈاکوؤں سے بدلہ لینے کی ترکیب سمجھ میں آگئی۔ اس نے تھیلے میں سے تار نکالے اور انھیں دہرا کر کے راستے میں دو درختوں سے مضبوطی سے اس طرح باندھ دیے کہ جو بھی اِدھر سے گزرے وہ تار سے الجھ کر گر پڑے۔ اِدھر اُدھر سے بہت سے پتھر اکٹھا کر کے راستے میں بکھیر دیے تاکہ جو بھی گرے اسے اچھی طرح چوٹ آئے۔ یہ سب کرنے کے بعد ایک گھنی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا اور ڈاکوؤں کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

(جاری...)

■

ماخذ: بے زبان ساتھی، **مصنف:** وکیل نجیب، **سنہ اشاعت:** چوتھی طباعت 2014، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

دانائی کی باتیں

★ زندگی میں دس برس کمانے میں لگتے ہیں۔ دس برس کمائے ہوئے کو کھانے میں لگتے ہیں اور دس برس اس کھائے ہوئے کو ہضم کرنے میں لگتے ہیں اور پھر دس برس نیک نامی کے لیے بھی چاہئیں مگر اس ساری محنت پر پانی پھیرنے کے لیے تین برس کافی ہیں۔ (کنفیوشس)

★ علم دو باتوں کا نام ہے کہ آپ کیا جانتے ہیں اور کیا نہیں جانتے؟ (کنفیوشس)

★ جب تک آپ کے والدین زندہ ہیں آپ کو مقدس مقامات کی زیارت کے لیے جانے کی ضرورت نہیں۔ (کنفیوشس)

★ میں پیدا ہوا تو مجھے یہ علم نہ تھا کہ مجھے لوگوں کو کیا تعلیم دینی ہے۔ میں نے ماضی کے علم کو دریافت کیا اور جان لیا کہ مجھے کیا اور کیسے درس دینا ہے؟ (کنفیوشس)

★ اگر آپ کسی چھوٹی چیز پر نظر لگائے بیٹھے ہیں تو بڑی چیز آپ کو کبھی نہیں ملے گی۔ (کنفیوشس)

★ اگر تم ایسی باتیں سنو جو تم کو ناگوار معلوم ہوتی ہوں تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ کہیں یہ صحیح تو نہیں ہیں۔ (کنفیوشس)

★ محبت، انسانیت کا دوسرا نام ہے۔ (گوتم بدھ)

★ سُکھ میں سُکھ حاصل نہیں ہوسکتا، دکھ میں شاید ہو جائے۔ یہی سوچ کر میں نے تخت و تاج چھوڑ دیا۔ (مہاتما بدھ)

★ نجات، دنیا کے ساتھ رہ کر حاصل نہیں ہوسکتی۔ (گوتم بدھ)

★ محنت اور جدوجہد کے ذریعے ہر قسم کی قید سے آزادی حاصل کرو۔ (مہاتما بدھ)

★ جن پر حقیقت کا انکشاف ہوا اور جنھوں نے عرفان حاصل کیا ان کے لیے دنیا کوئی کشش نہیں رکھتی۔ ذرا غور تو کرو سمندر کے پانی میں مچھلی کے چلنے پھرنے سے کوئی لہر پیدا نہیں ہوا کرتی۔ (بھرتر ہری)

★ وہ خوشی کے دن کب آئیں گے کہ جب میں کوہ ہمالیہ کی کسی چٹان پر دنیا سے بے خبر آنکھیں بند کیے کسی خوبصورت تصور میں محو ہوں گا اور بوڑھے ہرن بے خوف و خطر اپنے کندھوں کو میرے جسم سے مل کر اپنی خارش مٹائیں اور مسرت پائیں گے۔ (بھرتر ہری)

★ جن لوگوں نے علم حاصل کیا نہ کوئی خوبی حاصل کی اور نہ روحانی ترقی کی۔ وہ صرف نام ہی کے آدمی ہیں بلکہ دراصل وہ زمین پر بوجھ ہیں۔ (بھرتر ہری)

★ خاموشی ایک بیش بہا خزانہ ہے جو قدرت نے انسان کو بخشا ہے یہ جہالت کا غلاف ہے۔ (بھرتر ہری)

★ کنول کی نازک شاخ سے ہاتھی کو باندھا جاسکتا ہے۔ ہیرے کو سرسوں کے پھول کی پتی سے کاٹا جاسکتا ہے۔ شہد کی ایک بوند سے کھارے سمندر کو میٹھا کیا جاسکتا ہے لیکن مرد ناداں کو میٹھی باتوں سے رام کر لینا ناممکن ہے۔ (بھرتر ہری)

چمن چمن کے پھول

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

(نواب محمد یار خاں اسیر)

شعلہ بھڑک اٹھا مرے اس دل کے داغ سے
آخر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

(مہتاب رائے تاباں دہلوی)

ہائے رے حالات اک مہمان لوٹانا پڑا
میں نہیں ہوں گھر میں یہ بچے سے کہلانا پڑا

(سبط علی صبا)

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

(صادق حسین صادق)

اک شجر ایسا محبت کا لگایا جائے
جس کا ہمسائے کے آنگن میں بھی سایہ جائے

(شاہد احسن مراد آبادی)

پہچان آدمی کی نہیں سہل آج کل
اک آدمی چھپا ہوا ہر آدمی میں ہے

(افسر ماہ پوری)

اب ہم بھی سوچتے ہیں کہ بازار گرم ہے
اپنا ضمیر بیچ کے دنیا خرید لیں

(اقبال عظیم)

تم بھی ضمیر بیچتے نازش تو کرتے عیش
راحت کی آرزو تھی تو خود دار کیوں ہوئے

(نازش سکندر پوری)

الماس کی قیمت کیا، پتھر ہی گہر ٹھہرا
اس دورِ ترقی میں ہر عیب ہنر ٹھہرا

(ناشر بلیاوی)

شیشے کے گھر کی ضمانت کون دے
رقص میں ہیں ہر طرف پتھر بھی دیکھ

(ارشد الاعظمی)

آدمی جب بھی فلک بوس عمارت میں رہے
چاہیے اس کو دعاؤں کی حفاظت میں رہے

(ساحل مونگیری)

وہ عطر دان سا لہجہ مرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو

(بشیر بدر)

شدتِ بھوک ستائے تو عوض روٹی کے
زہر کھالے کسی کم ظرف کا احسان نہ لے

(شور فیض آبادی)

ہر قدم مشکل نہ ہو کیوں زندگی کی راہ میں
آدمی پتھر بنا ہے آدمی کی راہ میں

(ازلی غواصی)

ضیا عالم کوسگوی

آپ کی صحت

طبی ماہرین نے کہا ہے کہ دانتوں کی صفائی کا یادداشت سے گہرا تعلق ہے۔ دانتوں اور مسوڑھوں کو صاف رکھنے سے یادداشت کم ہونے کی بیماری لاحق نہیں ہوتی۔ تحقیق کے دوران مسوڑھوں کی بیماریاں اور یادداشت میں کمی کے درمیان تعلق دیکھا گیا ہے۔ صاف دانت جہاں یادداشت میں کمی کے امکانات کو کم کرتے ہیں، وہیں دل کی بیماریوں کے امکانات کو بھی کم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

طبی ماہرین نے کہا ہے کہ روزانہ 25 منٹ ورزش یا کھیل کود کا عمل چھوٹے بچوں کی ہڈیوں کو مضبوط بنانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

بچپن میں ہونے والی مضبوط ہڈیاں آخری عمر تک پاسدار مضبوط ہوتی ہیں۔ ماہرین نے اپنی سفارشات میں کم سے کم دورانیہ 25 منٹ لکھا ہے جبکہ زیادہ سے زیادہ دورانیہ ایک سے دو گھنٹے تک مقرر کیا جاسکتا ہے۔

برگر، پزّا، چپس، آلو کے چپس اور کولڈ ڈرنک آپ کو غیر فعال اور کمزور بناتے ہیں۔ یہ ابتدائی بیماریوں اور جگر فیل ہونے کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں۔ سردیوں میں گرم پانی سے اور گرمیوں میں ٹھنڈے پانی سے دو مرتبہ نہانے سے تھکن اتر جاتی ہے اور اور آپ کا جسم چست اور جراثیم سے محفوظ رہتا ہے۔ اگر جلدی سوئیں اور صبح جلدی اٹھیں تو آپ اپنی کلاس میں ذہین سمجھے جائیں گے۔ کیونکہ 8 گھنٹے نیند لینے سے آپ کا دماغ ترو تازہ ہوجائے گا اور آپ کی ذہنی صلاحیتوں میں اضافہ ہوگا۔

■

Zia Alam
H.No: 10/10/27/2, Indira Gandhi Puram
Hyderabad - 500018 (Telangana)

سمیع الدین

بھارت ایک تعارف

* بھارت براعظم ایشیا میں واقع ہے۔
* بھارت کا رقبہ 3287263 مربع کلومیٹر ہے۔
* بھارت رقبہ کے لحاظ سے ساتویں نمبر پر ہے۔
* بھارت میں بشمول یونین علاقے کل 36 ریاستیں ہیں۔
* بھارت میں تین موسم ہوتے ہیں: موسم گرما، موسم سرما اور مانسون۔
* بھارت میں تقریباً 18 زبانیں بولی جاتی ہیں۔
* بھارت کا قومی کھیل ہاکی ہے۔
* بھارت کا قومی پھول کنول ہے۔
* بھارت کا قومی پرندہ مور ہے۔
* بھارت کا قومی جانور شیر ہے۔
* بھارت کی راجدھانی دہلی ہے۔
* بھارت کا قومی پرچم تین متوازی رنگوں پر مشتمل ہے۔

جو 22 جولائی 1947 کو منظور کیا گیا۔ سب سے اوپر کیسری درمیان میں سفید اور آخر میں گہرے سبز رنگ ہوتے ہیں۔ سفید پٹے میں 24 لکیروں والا پہیہ ہوتا ہے اور قومی پرچم کی لمبائی اور چوڑائی 2:3 ہے۔

■

Samiuddin
Flat No:4, Raheem Palaza, VIP Road
Near Town Hall
Aurangabad (Maharashtra)

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہوگئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کر سکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کر لیں تو سمجھ لیں کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

■ جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں

ہنسی کے غبارے

ایک لڑکا امتحان میں فیل ہوگیا۔فیل ہونے کی خبر سنانے سے پہلے اس نے اپنے باپ سے پوچھا:

ابا جان جب آپ فیل ہوئے تھے تو آپ کے والد نے کیا کہا تھا۔

انھوں نے مجھے بہت مارا تھا باپ نے جواب دیا:

اچھا جب آپ کے ابا فیل ہوئے تھے تو آپ کے دادا نے کیا کہا تھا۔لڑکے نے پوچھا:

انھوں نے میرے باپ کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے تھے۔باپ نے کہا۔

ابا جان اگر آپ میرا تعاون کریں تو ہم یہ خاندانی غنڈہ گردی ختم کر سکتے ہیں۔لڑکے نے کہا۔

ایک صاحب نے ڈاکٹر سے کہا آپ نے واقعی اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔آپ نے کہا تھا کہ آپ کے علاج کی بدولت دو مہینے کے اندر میں اپنے پیروں سے چلنے پھرنے لگوں گا۔

ڈاکٹر مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔

ان صاحب نے جواب دیا ہونی بھی چاہیے مجھے جب آپ کا بل ملا تو اپنی کار بیچ دینی پڑی۔

ریل گاڑی میں نیچے والی برتھ پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے ایک مسافر سے کہا:

بھائی صاحب! اتنا بڑا صندوق اوپر نہ رکھیں۔ ہوسکتا ہے میرے اوپر آ گرے۔

فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس میں ٹوٹنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔

ایک دیہاتی اخبار کے دفتر میں پہنچا اور کہا ایک آدمی مرگیا ہے۔اس کی موت کی خبر چھپوانی ہے۔

اسے بتایا گیا کہ خبر کی جگہ اشتہار شائع ہوگا۔

دیہاتی نے اشتہار کا خرچہ پوچھا۔

اسے بتایا گیا کہ پچیس روپے فی انچ۔

دیہاتی بولا یہ تو بہت مہنگا ہے مرنے والا چھ فٹ تین انچ کا تھا۔

پہلا وکیل: تم جھوٹے ہو۔

دوسرا وکیل: تم فراڈیئے اور دھوکے باز ہو۔

جج: آپ دونوں کو اپنی اپنی اصلیت معلوم ہوگئی ہے۔ اب مقدمہ کی پیروی شروع کریں۔

ابوبکر اپا صاحب عطار

چالاک گھوڑا

ایک گھوڑا جنگل میں گھاس چر رہا تھا۔ بھوکے گیدڑ نے گھوڑے کو دیکھا اور اسے کھانے کے لیے دوڑ پڑا۔ گھوڑے کو اس سے بچنا مشکل نظر آیا۔ اتنے میں اس کو ایک ترکیب سوجھی۔ وہ گیدڑ سے کہنے لگا: گیدڑ بھیا! گیدڑ بھیا! میرے پچھلے پیر میں کانٹا چبھ گیا ہے۔ وہ تمھارے منہ میں چبھ جائے گا۔ اس لیے پہلے کانٹا نکال دو پھر مجھے کھالینا۔

گیدڑ اس خوشی میں گھوڑے کے پچھلے پیر کے پاس آ گیا۔ فوراً گھوڑا اپنے پیروں سے گیدڑ کو مارنے لگا۔ گیدڑ نیچے گر پڑا اور گھوڑا بھاگ نکلا۔

■

Abu Bakar Appasab Attar
6th, Govt Urdu Higher Primary School
No:2, Bailhongal (Karnataka)

ادیبہ عفت

ماں

تو میرے لیے گھنے بادل جیسی
تو میرے لیے ساون بھادوں جیسی
تو میرے لیے آسماں پر تارے جیسی
تو میرے لیے سورج کی کرنوں جیسی
تو میرے لیے پھولوں کی خوشبو جیسی
تو میرے لیے گلشن کے مالی جیسی
تو میرے لیے کوئل کی میٹھی بولی جیسی
تو میرے لیے دوست و ہم دم جیسی

■

Adeeba Iffat
Class: XII
MS Inter College
Sikandarabad

ارم فاطمہ محمد معظم، درجہ ہشتم، التفات گنج، ضلع امبیڈکرنگر، یوپی

مسکان فاطمہ توفیق احمد، درجہ ہفتم، التفات گنج، ضلع امبیڈکرنگر، یوپی

مدرسہ اہل سنت ضیاء العلوم محلّہ باغیچہ، امبیڈکر نگر میں سوچھ بھارت مشن کے تحت کرائے گئے پینٹنگ مقابلے میں انعام یافتہ ڈرائنگس

اریبہ فاطمہ بنت ابرار علی خان، درجہ ششم
سلیمانیہ اردو ہائی اسکول، مانورہ، مہاراشٹر

کشفیہ انجم وحید خان، درجہ ششم، ضلع پریشد اردو ڈجیٹل اسکول
کرہ، تعلقہ چاندور بازار، ضلع امراؤتی، مہاراشٹر

ارشید شیخ طاہر مانورہ، درجہ پنجم، سلیمانیہ اردو ہائی اسکول، مہاراشٹر

محمد شریف سوداگر میموریل ہائی اسکول، دیسائی گنج، ورشہ، مہاراشٹر

وسیم شیخ صلاح الدین، درجہ ہفتم
مالیگاؤں پالیکا اردو پرائمری اسکول نمبر 31، مالیگاؤں، مہاراشٹر

صبا فرحین شیخ بشیر، درجہ پنجم، فاطمہ پرائمری اسکول، پربھنی، مہاراشٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

فسانہ عجائب

مصنف: رجب علی بیگ سرور

صفحات: 91

قیمت: 25 روپے

کیفیہ

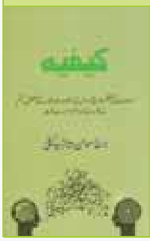

مصنف: برج موہن دتاتریہ کیفی

صفحات: 294

قیمت: 140 روپے

اربابِ نثر اردو

مصنف: سید محمد

صفحات: 247

قیمت: 135 روپے

تاریخ تحریکِ آزادیِ ہند

مصنف: تاراچند

صفحات: 736

قیمت: 310 روپے

معاصر تنقیدی رویے

مصنف: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 279

قیمت: 125 روپے

تفہیمات وترجیحات

مصنف: شیخ عقیل احمد

صفحات: 237

قیمت: 130 روپے

خودنوشت سوانح عمری: شیخ علی حزیں لاہجیؒ

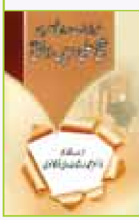

ترجمہ وتقدیم: ڈاکٹر محمد ارشاد ندوی نوگانوی

صفحات: 136

قیمت: 85 روپے

مشاہیر ادبیات مشرق

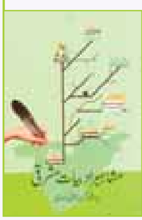

مصنف: پروفیسر محسن عثمانی ندوی

صفحات: 292

قیمت: 145 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, November 2019, Vol. 07, Issue: 11
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439/2019-21
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/10/19
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

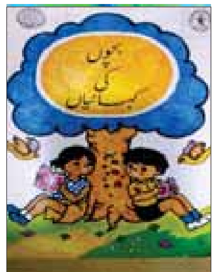

صفحات:112، قیمت: 25 روپے

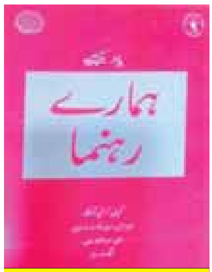

صفحات:106، قیمت: 35 روپے

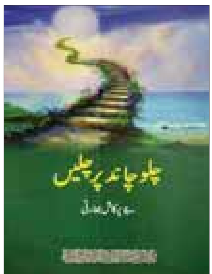

صفحات:48، قیمت: 16 روپے

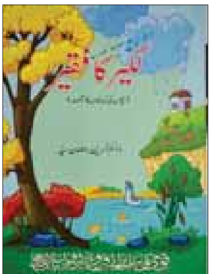
صفحات: 82، قیمت: 35 روپے

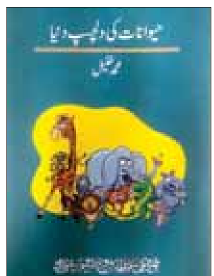

صفحات:83، قیمت: 24 روپے

صفحات:61، قیمت: 20 روپے

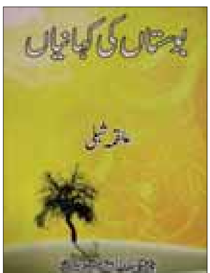

صفحات:87، قیمت: 20 روپے

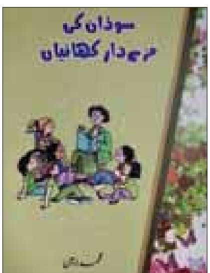

صفحات: 61، قیمت: 20 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.